جدید پاکستانی افسانے میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار

The Expression of Changing Cultural Values in Modern Pakistani Short Stories

محمد یوسف* / ڈاکٹر محمد افضال بٹ**

Abstract:

Fiction written after the formation of Pakistan is called modern urdu fiction. Modern urdu fiction is not only the name of symbolism and abstraction, but also the distance from outdated traditions and ideas in the hallmark of modern urdu fiction. In fact modern urdu fiction is the name of a trend in which there is an open rebellion against the prevailing rules and regulation, form and technical principles. The writer and literature are related to society. Literary creations reflect the events and changes that take place in society. In the twentieth century, scientific inventions influenced cultural values, in particular. The arrival of British in India had a detrimental effect on the culture of this region. The narcissism, selfishness and carnage that resulted from the partition of India also affected positive human values. In addition martial law in Pakistan also contributed to the change of cultural values. All these changing cultural values are reflected in modern Pakistani fiction.

Key words: Fiction, Traditions, Symbolism, Abstraction, Rebellion, Literature, Cultural Values, Detrimental, Narcissism, Camage

*استاد (شعبہ اردو) گورنمنٹ میاں محمد نواز شریف کالج سرگودھا

**استاد شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

اردو افسانہ ایک صدی کی مسافت طے کر چکا ہے۔ اس ایک صدی کے دوران اردو افسانے میں کافی تجربات کیے گئے ہیں۔ رومانیت، حقیقت نگاری، ترقی پسندی، جدیدیت اور مغربی افکار و نظریات کے اثرات اردو افسانے میں دکھائی دیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ باقی اصناف ادب کی طرح اردو افسانے کی زبان میں بھی کافی تنوع دکھائی دیتا ہے۔ جب پرانے افسانے کی زبان لفظوں کا گلیشیر بن گئی تو افسانہ نگاروں نے اس یکسانیت سے بیزاری کا اظہار کیا اور لفظوں کو ایک معنی کی بجائے کئی معنوں میں علامتی طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ جہاں تک علامتی افسانے کا تعلق ہے تو علامتی افسانہ ۱۹۶۰ء سے پہلے ہی تحریر کیا جا چکا تھا۔ سعادت حسن منٹو کا "پھندنے"، کرشن چندر کا "غالیچہ" اور احمد علی کا "میرا کیمرا" اس کی مثال ہے۔ گویا جدید اردو افسانہ صرف علامت نگاری اور تجریدیت ہی کا نام نہیں ہے بلکہ فرسودہ روایات اور خیالات سے دوری اور کنارہ کشی بھی جدید افسانے کی پہچان ہے۔ در حقیقت جدید اردو افسانہ ایک رجحان کا نام ہے جس میں مروجہ اصول و ضوابط، ہیئت اور فنی اصولوں کے خلاف کھلے عام بغاوت کی گئی ہے۔

ثقافت انسانی رویے اور انداز و اطوار کا نام ہے اور اس کی تشکیل کا عمل فرد کی سلیقہ مندی اور شعور سے شروع ہوتا ہے اور معاشرے کے اجتماعی انداز و اطوار میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ یوں تشکیل پانے والی ثقافت میں اس معاشرے کے اجتماعی رویوں کی عکاسی ہوتی ہے اور یہی اجتماعی رویئے اس معاشرے کی پہچان بن کر سامنے آتے ہیں۔ کوئی بھی رویہ یا طرز عمل جب تک فرد کی ذات تک محدود رہے گا تب تک وہ ثقافت یا کلچر کے زمرے میں داخل نہیں ہو پائے گا۔ ثقافت کی تشکیل میں مذہب اور دیگر عناصر بھی کار فرما ہوتے ہیں۔ مذہب، معیشت اور عقائد و افکار معاشرے کے بنیادی اداروں کی حیثیت سے معیارات تشکیل کرتے ہیں اور یہ رویئے اور طرز عمل کسی بھی ثقافت کی اصل قوت ہوتے ہیں انہی رویوں سے معاشرے کی مختلف رسوم جنم لیتی ہیں جو کسی معاشرے کی ثقافتی شناخت بن جاتی ہیں۔

ادیب اور ادب کا تعلق معاشرے سے ہوتا ہے۔ سماج میں رونما ہونے والے واقعات کی جھلک ادبی تخلیقات میں نظر آتی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی قتل و غارت، لوٹ مار اور اور عدم تحفظ کے ماحول نے یہاں کے لوگوں کی سوچ اور رویوں کو بالخصوص تبدیل کیا۔ تقسیم کے بعد ترقی کے خواب دیکھنے والے عوام کو ناکام جمہوری حکومتوں اور مارشل لاز نے بدحالی اور مایوسی کے علاوہ کچھ نہ دیا۔ یوں مملکت خداداد پاکستان تیزی سے زوال کی سیڑیاں اترنے لگی۔ یہ فطرتی امر ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا کلچر پسماندہ قوموں میں تیزی سے پروان چڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ جب زوال کا شکار ہوا تو مغربی تہذیب کی زد میں آگیا۔ یہی وہ دور تھا

جب پوری دنیا میں بہت تیزی سے سائنسی ترقی ہوئی اور دنیا ایک گلوبل ویلج بن گئی۔ یہ وہ وجوہات تھیں جو پاکستان میں ثقافتی تبدیلی کا سبب بنی اور ان ثقافتی تبدیلیوں کی بازگشت جدید اردو افسانے میں سب سے زیادہ سنائی دیتی ہے۔

اداروں اور حکومت کی ناکامی اور معاشرتی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے پاکستان میں جو نفسا نفسی،خود غرضی، تنہائی، بے بسی، تذلیل، بے روزگاری اور عدم تحفظ کی فضا پیدا ہوئی اور اس نے ثقافتی اقدار کو جس تیزی سے تبدیل کیا اس کا بھرپور عکس جدید اردو افسانہ نگاروں ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، قراۃ العین حیدر، انتظار حسین، انور سجاد، بانو قدسیہ، خالدہ حسین، رشید امجد، محمد منشا یاد، مسعود اشعر، اسد محمد خان، محمد مظہر الزمان، مظہر الاسلام، مرزا حامد بیگ اور نیلم احمد بشیر کے افسانوں دکھائی دیتا ہے۔

ممتاز مفتی زیرک اور ممتاز ادیبوں میں شامل ہیں۔ ان کا شمار ابتدائی جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بیانیہ اور علامتی دونوں قسم کے افسانے تحریر کیے۔ ان کے اکثر افسانوں کی ظاہری سطح معنوی سطح سے مختلف ہے۔ تقسیم ہند کو انھوں نے اپنی نظروں سے دیکھا۔ وہ اقدار کی تبدیلی کا ایک دل خراش نظارہ تھا۔ ممتاز مفتی کی معاشرے پر گہری نظر رہی اور وقت کے ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرے میں جو ثقافتی تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں انھوں نے نہ صرف ان کو محسوس کیا ہے بلکہ ان کا اظہار بھی ان کے افسانوں میں کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مرزا حامد بیگ نے ممتاز مفتی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> "ممتاز مفتی نے اپنے طویل تخلیقی سفر میں تبدیل ہوتے ہوئے حالات کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور سماجی محرکات کے شعور کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ افسوس کہ ہمارے ناقدین نے مفتی سے متعلق رائے قائم کرنے میں صرف "جھکی جھکی آنکھیں" سے "آپا" تک کے مطالعہ کو بنیاد بنایا۔"(۱)

ممتاز مفتی کے افسانوں میں جہاں قومی اداروں میں اقدار کی تبدیلی کی بات کی گئی ہے وہیں لوگوں کی نجی زندگی میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ان کے افسانے اس بات کے عکاس ہیں کہ کچھ عرصہ قبل گھروں کی ایک مخصوص فضا تھی۔ جائنٹ فیملی سسٹم میں بزرگوں کا ایک خاص رکھ رکھاؤ تھا لیکن جیسے جیسے تعلیم عام ہوتی گئی بزرگوں کے احترام میں کمی آتی گئی اور اب اقدار یہاں تک تبدیل ہو چکی ہیں کہ بقول اقبال:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

رواں دور میں جواں سال بچوں کا اپنے والدین کے ساتھ برتاؤ قابل تحسین نہیں رہا۔ جدید تعلیم نے نوجوانوں کو متاع تہذیب سے تو محروم رکھا ہے لیکن اتنا با اختیار ضرور کر دیا ہے کہ وہ اپنے روشن مستقبل کے لیے تمام

فیصلے خود کرنا چاہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں والدین کی عزت اور بھرم تو تھا ہی اس کے ساتھ ساتھ بزرگوں اور اعزہ و اقارب کا بھی خاص احترام کیا جاتا تھا۔ لیکن اب تمام رشتے بے وقعت ہو چکے ہیں لڑکے تو کجا اب لڑکیاں بھی زندگی کے باقی معاملات کی طرح اپنے شریک حیات کا انتخاب بھی خود کرنا پسند کرتی ہیں۔ یہ تمام حالات جنہیں ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے ظاہر کرتے ہیں کہ نوجوان نسل نہ صرف اپنی مشرقی تہذیب و ثقافت کو فراموش کر کے مغربی ثقافت سے متاثر دکھائی دیتی ہے بلکہ اس کی مقلد بھی ہے۔ والدین اور اولاد میں مشرقی تقدس کا رشتہ کس قدر کمزور ہو چکا ہے اس کی مثال ممتاز مفتی کے افسانے "مانا نمانہ" میں ملاحظہ فرمائیے:

> "نمانہ کی والدہ خانم پرانے زمانے کی خاتون تھی۔ سمجھ دار تھی۔ سیانی تھی۔ لیکن جب سے بچے جوان ہوئے تھے، بے چاری کنفیوزڈ ہو کر رہ گئی تھی۔ جب بھی کوئی بات کرتی تو لڑکیاں بڑے پیار سے اسے بغل میں دبا لیتیں۔ کہتیں "امی آپ اس بات میں دخل نہ دیں۔ آپ نہیں سمجھتیں۔" اس کے باوجود امی بات جاری رکھتیں تو نمانہ کانوں پر ہتھیلیاں رکھ لیتی امی بور نہ کرو نا۔ پلیز امی، خانم کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ نوجوان بات بات پر بور کیوں ہو جاتے ہیں۔"(۲)

ممتاز مفتی کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوان نسل خود کو اعلیٰ اور اپنے بزرگوں کو کم علم یا جاہل تصور کرتی ہے۔ پرانے وقتوں میں بڑوں کی نصیحت آموز باتوں کو توجہ سے سنا جاتا تھا اور ان پر عمل پیرا ہو کر کامیاب زندگی بسر کی جاتی تھی۔ بڑوں کی نصیحت سے نوجوان بور ہوتے تھے اور نہ ہی برہمی کا اظہار کرتے تھے۔ لیکن اب جو ثقافتی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں انھوں نے نوجوان نسل میں یہ سوچ پیدا کر دی ہے کہ گویا بزرگ جینے کی تڑپ سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت نہیں اور نہ حوصلہ ہے کہ وہ بھڑک سکیں غرض وہ ہماری بوریت کو سمجھنے کی استعداد ہی نہیں رکھتے۔

ماضی میں انسان کو مال نہیں بلکہ کردار کے ترازو میں تولا جاتا تھا۔ یہی وہ معاشرتی معیار تھا جو اہل علم اور دانشور لوگوں کو قابل قدر بنا دیتا تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سوچوں میں تبدیلی آگئی اور انسان کو دیکھنے کی بجائے اس کے لباس، مال و دولت اور کاروبار کو دیکھا جانے لگا۔ یوں انسان کے کردار اور علم و دانش کی اہمیت ختم ہوتی گئی جس نے اعلیٰ معاشرتی اقدار کو دھیرے دھیرے دفن کر دیا۔ اب معاشرے میں ہر طرف مال و دولت سمیٹنے کے لیے ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے نکلنے کی سعی جاری ہے۔ اس سعی نے ظاہری شان و شوکت کو تو فروغ دیا ہے لیکن باطن کی خوبیاں ناپید ہو گئی ہیں۔

اعلیٰ معاشرتی اقدار کو تہس نہس کرنے میں سائنسی ترقی نے بھی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اس جدید دور میں

دنیا ایک گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پذیر معاشرے مغربی ثقافتی یلغار کی زد میں ہیں۔ زبان، لباس غرض تمام معاملات میں مغربی ممالک کی تقلید کی جاتی ہے اور نت نئے فیشن فروغ پا رہے ہیں۔ ایک طرف خواتین فیشن کی اس دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہی ہیں تو دوسری طرف مرد بھی مقابلے کی اس دوڑ میں کود پڑے ہیں۔ فیشن کا یہ مقابلہ اتنا سخت ہے کہ بعض اوقات عورت اور مرد میں تفریق کرنا کٹھن ہو جاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں کردار اور علم کا حسن لباس کے فیشن اور میک اپ کے سامانوں میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ غرض معاشرہ اخلاقی زبوں حالی کا شکار ہے۔ ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان سطحی تبدیلیوں پر وہ فکر مند ہیں۔ اپنے افسانے "کمرہ نمبر ۱۷" میں بننے سنورنے کے جنون کو جو مسلسل بڑھ رہا ہے، یوں تنقید کا نشانہ بناتے ہیں:

> "پہلے بال پھول بنے۔ پھر کھل کر شانوں پر بکھر گئے، پھر کٹ گئے۔ جھاڑ فانوس کی شکل اختیار کر گئے۔ ناخون چھریاں بن گئے۔ لپ سٹک کے رنگ گہرے ہوتے چلے گئے۔ لاؤڈ آنکھیں کشتیاں بن کر ڈوبنے لگیں۔ یہاں تک کہ صبیحہ کے نام نے بھی کئی ایک کینچلیاں بدلیں۔ صبیحہ سے صبیح، پھر صبوحی، پھر صبو۔ جسم بوتل کی شکل اختیار کر گیا۔ لباس جسم سے ایسا چمٹا کہ دونوں میں فرق نہ رہا۔ ابھار تیکھے ہو گئے، گولائیاں نمایاں۔"(۳)

ثقافتی تبدیلیاں شہروں تک محدود نہیں رہیں بلکہ جدید ٹیکنالوجی کی یلغار نے دیہی زندگی کو بھی کافی متاثر کیا ہے۔ ماضی میں دیہات اپنے فطرتی حسن کی وجہ سے منفرد ثقافت کے حامل تھے۔ درخت ہریالی، پرانی تعمیرات، مزاجوں کی وسعت اور سادگی، گاؤں میں اب یہ سب کچھ گئے دنوں کی بات ہے۔ سائنسی ترقی نے دیہاتی کسان کا مزاج اور اوزار سب کچھ تبدیل کر دیا ہے۔ دیہاتوں میں جو کام انسان اور جانور سرانجام دیتے تھے، آج کل مشینوں کے ذریعے کیے جا رہے ہیں اور جفاکش دیہاتی لوگ بھی اب سہل پسند ہو چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہروں میں پائی جانے والی امراض اب دیہاتوں کی طرف بھی منتقل ہو رہی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے دیہاتی ثقافت کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے دیہاتوں میں واقع ہونے والی ثقافتی تبدیلیوں کو اپنے کہانیوں میں سمو دیا ہے۔ اپنے افسانے "بیٹے بیٹیاں" میں وہ بیان کرتے ہیں کہ روزگار کے حصول کے لیے لوگ دیہاتوں سے شہروں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ جب وہ شہروں میں رہائش اختیار کر لیتے ہیں تو ان کے لباس، چال ڈھال اور بول چال میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ شہروں میں وہ جدید ٹیکنالوجی کا استعمال بھی سیکھ لیتے ہیں اور جب وہ واپس دیہاتوں میں جاتے ہیں تو یہی ثقافتی تبدیلیاں اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اس طرح دیہاتوں کی پرانی ثقافت تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے۔

ایک وقت تھا کہ شہروں اور دیہاتوں میں کھانے پینے کے لیے مٹی کے برتن ہی استعمال کیے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت تھی کہ مٹی کے برتن تمام جراثیم اور کیمیکل سے پاک ہوتے تھے اور ان کا استعمال ہی موزی امراض سے نجات کا سبب تھا۔ کمہار چاک پر مٹی کے خوبصورت برتن تیار کرتے، ان پر پھول پتیاں بناتے اور گدھوں پر رکھے پالان برتنوں سے بھر، گاؤں میں بیچ آتے۔ اس مقصد کے لیے گدھا گاڑی اوو بیل گاڑی کا بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بالعموم کٹائی کے موسم میں اناج کے بدلے مٹی کے برتن بیچے جاتے تھے۔ یوں بیساکھ کے مہینے میں پنجاب کی ثقافت کا پورے پنجاب میں بھرپور اظہار ہوتا۔ پھر سائنسی ترقی نے اس ثقافت کو یکسر تبدیل کر دیا، مٹی کے برتنوں کو گھروں سے اٹھا دیا گیا اور ان کی جگہ فیکٹریوں میں تیار ہونے والے سٹیل، چینی اور شیشے کے برتن استعمال کیے جانے لگے۔ یوں ہم نے ایک طرف تو اپنی خوبصورت ثقافت کو خیر آباد کہا اور دوسری طرف کئی مہلک امراض کو دعوت دی۔ اپنے فن کی بے قدری کو دیکھتے ہوئے دینو اپنا پیشہ چھوڑ کر شہر منتقل ہو گیا۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانے "بیٹے بیٹیاں" میں ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار اس طرح ہوا ہے:

> "دینو نازو کو لے کر مزدوری کرنے لائل پور کی طرف نکل گیا اور کچھ عرصے کے بعد وہاں سے خط لکھا کہ ہم نے یہیں جھونپڑی ڈال لی ہے۔ گاؤں میں آکر کیا کریں۔ مٹی کے برتنوں کا رواج اٹھ رہا ہے ہم خود چینی کے پیالوں میں چائے پیتے ہیں۔"(۴)

جدید دور نے انسان کو طبقاتی نظام سے بھی نوازا ہے۔ چند دہائیاں قبل تک غریب کی مدد کرنا اور مشکلات میں اس کا ساتھ دینا مشرقی ثقافت کا حسن تھا۔ لوگوں کو خوف خدا تھا اور دیکھا گیا کہ معاشرے کے وہ افراد جو ظالم اور چور اچکے ہوتے تھے ان کے دلوں میں بھی رحم موجود تھا اور تمام تر اخلاقی برائیوں میں ملوث ہونے کے باوجود ان کی انسانیت مری نہیں تھی اور وہ غریبوں کی دادرسی کر دیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہماری یہ خوبصورت ثقافتی اقدار تبدیل ہوتی گئیں اور اب نوعیت یہ ہے کہ غریب کا نہ کوئی دوست ہے اور نہ ہمدرد۔ غرباء کا خوب استحصال کیا جاتا ہے۔ امراء انھیں کولہو کے بیل کی طرح کام پر جوتے رکھتے ہیں اور جب ان کے تحفظ کا وقت آتا ہے تو کوئی انکی مدد کرنے اور ان کے زخموں پر مرحم رکھنے والا نہیں ہوتا۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانے "چوری" میں ثقافت کی ان تبدیلیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ کہانی بتاتی ہے کہ منگو ایک برات کو دیکھنے جاتا ہے اسی دوران اس کے دل میں دولہے کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے۔ ابھی وہ دولہے تک نہیں پہنچتا کہ اس کو پرس چوری کے الزام میں دھر لیا جاتا ہے اور خوب زدوکوب کیا جاتا ہے۔ وہ اپنے گاؤں کے زمیندار اور مولوی کو مدد کے لیے بلاتا ہے لیکن وہ اسی کی مدد کرنے کی بجائے اسے ہی برا بھلا کہتے ہیں۔ برات والے پولیس کو بلاتے ہیں اور تھانیدار کی جیب گرم کر دی جاتی ہے اور وہ

منگو کو خوب زدو کوب کرتا ہے۔ منگو کی جیب میں موجود چونی بھی تھانیدار ہتھیا لیتا ہے لیکن آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ منگو چور نہیں ہے کیوں کہ پرس تو گم ہی نہیں ہوا تھا۔

زمیندار کے روپے پر تو منگو کو افسوس نہ ہوا لیکن مذہبی رہنما یعنی امام مسجد سے اسے امید تھی کہ وہ اسکی دیانت داری کی تصدیق کرے گا اور اسے رہائی دلائے گا لیکن اس نے بھی غریب کا ساتھ نہ دیا جس سے منگو کے دل میں مولوی کا تقدس ختم ہو گیا اور اس کی سوچ یہاں تک تبدیل ہو گئی کہ، "وہ اپنی تمام نمازوں کو برباد سمجھنے لگا جو اس نے اس امام کے پیچھے پڑی تھیں۔" احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانے میں بتایا ہے کہ لوگ غریب کی مدد کرنے کی بجائے اس کی مصیبت پر مسکرا رہے ہیں۔ وہ اس کیفیت کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں:

"منگو زمین پر بیٹھا ایک تنکے سے مٹی کرید رہا تھا اور سوچ رہا تھا جس کم بخت نے بٹوا چرایا ہے وہ مجھ پر رحم کھا کر بٹوا چوپال کے وسط میں کیوں نہیں پھینک دیتا؟ غریب پر لوگ ترس کیوں نہیں کھاتے؟ سب میری مصیبت پر مسکرا کیوں رہے ہیں؟

عجب بات ہے! عجیب قانون ہے! عجیب سمجھ ہے؟"(۵)

اشفاق احمد نے نہ صرف معاشرے کا بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ تمام معاشرتی پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں بیان بھی کیا ہے۔ ان کے افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشفاق احمد کو یہ فکر لاحق ہے کہ معاشرے سے اچھی اقدار تیزی سے ختم ہو رہی ہیں اور مادی اقدار فروغ پا رہی ہیں، ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا عکس ان کے افسانوں میں موجود ہے۔

کچھ عرصہ قبل تک مسلمانوں کی اپنے دین سے گہری وابستگی تھی اور اپنے ایمان کے تحفظ کے لیے وہ سب کچھ کر گزرتے تھے۔ وہ اپنے ایمان کو دولت کے ترازو میں تولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی، زندگی تیز ہوتی گئی ویسے ویسے حوس زر نے انسان کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اچھی روایات کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ دور حاضر میں فکر معاش میں گرفتار ہر شخص فکر آخرت کو فراموش کر چکا ہے۔ جائز اور ناجائز کسی بھی طریقے سے دولت کا حصول انسان کا مدعا ہے۔ دولت کی اس حوس نے انسان کے ایمان کو کمزور کر دیا ہے، حب الوطنی کا جذبہ ناپید ہو چکا ہے، لوگ اپنے ملک کی عزت کو بھی کوڑی کے بھاؤ بیچنے کے لیے تیار ہیں۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانے "پل صراط اور پاسپورٹ" میں ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ کہانی بتاتی ہے کہ صدیق ایک دفتر میں ملازم ہو جاتا ہے اور پہلے ہی دن پانچ روپے کا نوٹ بطور رشوت وصول کر لیتا ہے۔ گھر واپس آتے ہوئے اس کی جیب کٹ جاتی ہے اور پانچ روپے بھی چوری ہو جاتے ہیں۔ اپنے

اثاثے کی بازیابی کے لیے وہ تھانے میں رپوٹ درج کراتا ہے اور اپنے ایماں کی بازیابی کے لیے سعی لاحاصل کرتا ہے۔اسی تگ ودو کے دوران وہ بیرون ملک چلا جاتا ہے۔وہاں پہنچ کر گم شدہ ایمان کی فکر سے آزاد،خوب کمائی کرتا ہے۔جب پاکستان لوٹتا ہے تو ایک بار پھر اسے ایمان کی یاد ستاتی ہے۔وہ مولوی صاحب کے پاس جاتا ہے کہ کسی نے میری جیب کاٹ کر میرا ایمان چوری کر لیا تھااور میں تب سے خالی، بہکی بہکی اوراجڑی زندگی گزار رہاہوں جس پر مولوی صاحب صدیق کو تسلی دیتے ہیں کہ فکر مند نہ ہوں سب ٹھیک ہے۔اس صورت حال کو اشفاق احمد نے اپنے افسانے "پل صراط اور پاسپورٹ" میں اس طرح بیان کیا ہے:

"مولوی صاحب نے تشفی آمیز لہجے میں پوچھا؟ آپ کے پاس شناختی کارڈ ہے؟"

جی ہاں!صدیق نے وثوق کے ساتھ کہا۔

پاسپورٹ ہے؟مولوی صاحب نے کہا

وہ بھی ہے!

گرین کارڈ ہے؟

وہ بھی ہے!

تو پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے مولوی صاحب نے صدیق کے کندھے پر محبت بھرا دھپا مار کر کہا، ان تینوں کی موجودگی میں ایمان کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی، سب خیر ہے۔"(۲)

جب انسان کا مقصد صرف دولت کا حصول ہے، چاہے وہ رشوت سے ملے یا جائز طریقے سے، ملک میں کمائی جائے یا بیرون ملک تو پھر اسے دولت کی فکر کرنی چاہیے۔اس کے علاوہ شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور گرین کارڈ کی فکر ضروری ہے کہ یہ چیزیں دنیاوی شناخت اور دولت کمانے کا ذریعہ ہیں۔ایمان کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہر دور کی اپنی اقدار ہوتی ہیں اور ان کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔مغرب کے لیے جو پل صراط عبور کرنا پڑتا ہے اس کے لیے شناختی کارڈ، پاسپورٹ اور گرین کارڈ کا ہونا لازمی ہے۔ایمان کی شرط لازم نہیں۔

اپر کلاس طبقے کی رائٹر کے طور پر شہرت پانے والی قراۃ العین حیدر نے ہند و پاک معاشرے کو بہت قریب سے دیکھا، دونوں صورتوں میں جڑے ہوئے بھی اور ٹوٹتے بھی۔تقسیم کے وقت خون کی جو ندیاں بہائی گئیں، قراۃ العین حیدر اس کی عینی شاہد ہیں۔صدیوں اکھٹے رہنے والے انسانوں نے جس طرح بنیادی انسانی اقدار کو فراموش کیا اس کا اثر قراۃ العین کی شخصیت پر بالخصوص ہوا ہے، دیگر ثقافتی تبدیلیوں کے ساتھ اس انسانی بے حسی کی ترجمانی ان کے کہانیوں میں خوب ملتی ہے۔

قراۃ العین حیدر اپنی کہانی "فوٹو گرافر" میں بیان کرتی ہیں کہ زندگی میں ٹھہراؤ اور سکون کا فقدان ہے۔ ہر طرف زندگی میں گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے اور گھمسان کے اس رن میں انسان اپنے دوستوں اور عزیزواقارب تک کو فراموش کر چکا ہے۔ خود غرضی، لالچ اور مفاد پرستی سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی ہے اور انسانیت سسک رہی ہے۔ جدید دور کا المیہ ہے کہ عروج میں سب دوست اور زوال میں کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ قراۃ العین نے اپنی کہانی میں انہی بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ ایک خاتون آرٹسٹ جب جوان ہوتی ہے تو فلم کے ڈائریکٹر اور ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنا کاروبار چمکانے کے لیے اس کا تعاقب کرتی پھرتی ہیں۔ فلم ڈائریکٹر کا مقصد حسین آرٹسٹ کے ذریعے اپنی فلم کو کامیاب بنانا مقصود ہوتا ہے جبکہ ملٹی نیشنل کمپنیاں اس کی خوبصورتی کو اپنی پروڈکشن بیچنے کے لیے استعمال کر رہی ہوتی ہیں۔ اسی آرٹسٹ کی جب عمر ڈھل جاتی ہے تو کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہوتا۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ نوجوان آرٹسٹ جو اس کا قریبی دوست ہے وہ بھی اسے فراموش کر دیتا ہے۔ کوئی اس کا تعاقب نہیں کرتا، کوئی اس کی تصویر نہیں بناتا، کوئی آٹو گراف نہیں لیتا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ خاتون آرٹسٹ عمر رسیدہ ہے اور خود غرض دنیا کے کسی مفاد کو پورا نہیں کر سکتی۔ افسانہ نگار نے خود غرضی کے ان رویوں پر تنقید کی ہے۔ جدید نسل کے رویوں پر تنقید کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ کیا انسانیت اس حد تک مر چکی ہے کہ دولت، شہرت اور مفاد سے آگے کوئی سوچنے کے لیے تیار ہی نہیں۔ قراۃ العین نے ان ثقافتی تبدیلیوں کا نوحہ ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

"میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا..... میں .....

اور..... اور..... آپ کے ساتھی؟ فوٹو گرافر نے آہستہ سے پوچھا۔ کوچ نے ہارن بجایا۔

آپ نے کہا تھا نا کہ کارزار حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔

اس گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

اوران کو کھوئے ہوئے بھی مدت گزر گئی۔ اچھا، خدا حافظ.....

زندگی انسانون کو کھا گئی۔

صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔"(۷)

انسان اور انسانیت تو جہاں فانی سے رخصت ہو گئے اب اکثر کاکروچ نما مفاد پرست اور آلودہ ذہنیت کے لوگ دنیا میں موجود ہیں جن کا مقصد صرف مالی منفعت ہے۔ اب یہی معیار انسانیت ہے۔

انتظار حسین نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب متحدہ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان کے افسانوں میں وہ سارے مسائل اور واقعات جو کہ تحریک آزادی کی وجہ سے پیدا ہوئے نظر آتے ہیں۔ تقسیم کے نتیجے میں نفسا نفسی کا وہ عالم شروع ہوا جس نے صدیوں اکھٹے رہنے والے انسانوں کو یکسر تبدیل کر دیا۔ انسانی اقدار کی یہ تبدیلیاں حیران کن تھیں۔ ان تبدیلیوں کا اظہار انتظار حسین کے افسانوں میں بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ انتظار حسین ماضی کی روایات کو گلے لگا کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ انتظار حسین کا عقیدہ ہے کہ جس کا کوئی ماضی نہیں اس کا حال اور مستقبل بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے افسانوں میں ماضی کی ثقافت اور اس ثقافت میں رونما ہونی والی تبدیلیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ خاص طور پر انسانی رویوں میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا اظہار ان کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ تقسیم کے بعد انسان کے رویوں میں پیدا شدہ تبدیلیوں کی بنیادی وجہ تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی افراتفری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

> "انتظار حسین کے ہاں اخلاقی اقدار کی شکست اور اجتماعی ضوابط کا فقدان جس خلفشار اور نفسی انتشار پر منتج ہوتا ہے اس طرح آج کا انسان جس عدم تحفظ اور خوف کی فضا میں سانس لے رہا ہے اس نے اس میں جس بے یقینی اور تذبذب کو جنم دیا ہے وہ بالآخر اسے اپنے وجود میں سکڑ کر مکھی بننے پر مجبور کر دیتا ہے۔"(۸)

مشرقی تہذیب میں زندگی کے تمام امور میں بزرگوں کا مثبت کردار ہوتا ہے۔ بڑے بڑے الجھے مسائل بزرگ اپنی دانست سے حل کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہری علاقوں میں بھی بزرگوں کا وقار قائم دائم ہے۔ پاکستان میں اب بھی پنچایت کا سسٹم موجود ہے جس میں اہل علاقہ کے زیرک اور بزرگ لوگ شامل ہوتے ہیں اور بڑے بڑے جھگڑوں کو مقامی سطح پر حل کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح لوگوں کو کورٹ کچہری کی اذیت سے بھی نجات مل جاتی ہے اور وہ مالی نقصان سے بھی بچ جاتے ہیں۔ مشرقی معاشرے میں یہ قدر بھی موجود ہے کہ بزرگ اپنے محلے اور گاؤں کے نوجوانوں اور بچوں کی تربیت کرتے ہیں اور انہیں صراط مستقیم کی طرف راغب کرتے ہیں۔ بزرگوں کے وجود کو محلے اور گھر کے لیے خیر و برکت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ معاشرے میں دیکھا گیا ہے کہ ان بزرگوں نے تمام افراد خانہ کو متحدہ رکھا ہوتا ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام انہی بزرگوں کا مرہون منت ہے۔ نقصان ہو یا فائدہ ان بزرگوں کی نصیحت اور فیصلوں کو حکم کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ تہذیب کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور بزرگوں کے مثبت کردار سے بھی محروم ہوتا جارہا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں جہاں تہذیب کی دیگر شکست وریخت کا تذکرہ کیا ہے وہی اس تہذیبی تبدیلی

کو بھی محسوس کیا ہے۔ ان کے افسانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو وہ بزرگ ہی دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں کہ جن کے مثبت کردار سے دنیا قائم دائم تھی کیوں کہ بقول ناصر کاظمی ایک خلاء ہے جسے محسوس کیا جا سکتا ہے:

میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے

ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

یا پھر ہماری نوجوان نسل نے اپنی اس بے پایاں دولت سے استفادہ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام متاثر ہو رہا ہے چھوٹے چھوٹے مسائل کچہریوں میں جاتے ہیں۔ لوگ دولت اور وقت دونوں ضائع کرتے ہیں۔ لوگوں میں عدم برداشت کا رویہ فروغ پا رہا ہے۔ فحاشی عام ہو رہی ہے۔ یقیناً معاشرہ کسی بڑی دولت اور نعمت سے محروم ہو گیا ہے۔ انتظار حسین نے اس کمی کو محسوس کیا ہے اور اپنے افسانوں میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ اپنے افسانے "محل والے" میں اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

"ایسا دیکھا گیا ہے کہ کبھی کبھی خاندان کا بھرم کسی ایک شخصیت کی وجہ سے بنا رہتا ہے۔ اس کے اٹھتے ہی ساکھ ایسی بگڑتی ہے کہ بننے میں پھر آتی ہی نہیں ہے۔ محل والوں کے ساتھ بھی کچھ یہی ہوا۔ جج صاحب نے اپنی زندگی میں خاندان والوں کو ایسا جما کے رکھا تھا کہ نہ تو کسی پر مفلسی کا دور آیا نہ آپس میں تفرقہ پیدا ہوا۔ ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی سارا خاندان تتلیوں کی طرح بکھر گیا۔ جائیداد کے بٹوارے تک کی نوبت آگئی۔"(۹)

دراصل یہ ساری برکات ان بزرگوں کی وجہ سے تھیں۔ جیسے ہماری قدیم ثقافت متاثر ہوئی تو روشن خیالی کے نام پر ہمارے معاشرے میں کافی برائیوں نے جنم لے لیا اور آہستہ آہستہ ہماری ان روشن روایات کو دیمک چاٹ گئی۔ اب ہمارا معاشرہ آہستہ آہستہ ان تہذیبی روایات کو خیر آباد کہتے کہتے اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ اخلاقی اور تہذیبی سطح پر ایک زوال شدہ معاشرہ بن گیا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں ایک برائی جو آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتی جا رہی ہے وہ "عقل کل" کی ہے بالخصوص نوجوان نسل اس برائی کا شکار ہے۔ یہ بات درست ہے کہ بزرگوں کے پاس ڈگریاں نہیں ہیں لیکن انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کے پاس تجربہ ہے۔ وہ نوجوان نسل کی جس طور رہنمائی کر سکتے ہیں، کتابوں کا علم اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ لیکن نوجوان نسل اس زعم کا شکار ہے کہ ان کے پاس جدید تعلیم ہے اور ان کے بزرگ اس سے محروم ہیں لہٰذا وہ بہتر سمجھتے ہیں اور اپنے فیصلے ان پرانے خیالات رکھنے والے بزرگوں کی نسبت بہتر کر سکتے ہیں۔ یہ ثقافتی تبدیلی نوجوانوں کو گمراہ کر رہی ہے۔ جدید اور اعلیٰ تعلیم کا حاصل

کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن جدید علم بزرگوں کے تجربات کو رد کرنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ اگر اس جدید اور قدیم علم کا اختلاط کر کے آگے بڑھا جائے تو نتائج بہتر حاصل کیے جا سکتے ہیں لیکن نوجوان نسل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ انتظار حسین جنہوں نے معاشرے کا بہت گہرا مشاہدہ کیا ہے انہیں اس بات کا احساس ہے کہ یہ ثقافتی تبدیلی آنے والی نسلوں کو گمراہی کی طرف لے جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بہت سے افسانوں میں انہوں نے نوجوان نسل کے اس منفی رویے کی نشان دہی کی ہے۔ اپنے افسانے "محل والے" میں وہ اس امر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"پروفیسر شاہ بولے، میں تو کچھ جانتا نہیں۔
جدید جغرافیہ یہی کہتا ہے "اچھا آیا ہے جدید جغرافیہ"
چھوٹے میاں گرم ہوئے۔ "اس کے معنی تو یہ ہیں کہ
ہمارے سارے بزرگ اب تک نماز غلط پڑھتے تھے"۔
"جو کچھ بھی آپ سمجھیں بہر حال یہ مسجد بنے گی تو قبلہ رو بنے گی"
اور یہ کہہ کر پروفیسر شاہ اپنے گھر کی طرف ہو لیے۔"[۱۰]

ڈاکٹر انور سجاد کے افسانوں کے موضوعات آفاقی ہیں۔ ان کے افسانوں کو کسی مخصوص جغرافیائی حد میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے افسانوں میں انسان کی مجموعی الجھنوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں کا مرکزی کردار انسان ہے جو اپنی ذات کی گھٹن کا شکار ہے۔ انسان کی اس گھٹن کو انور سجاد نے قریب سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ انور سجاد کے افسانوں میں بیک وقت دور حاضر اور دور حاضر میں واقع ہونے والی ثقافتی تبدیلیاں جھلکتی ہیں۔

معاشروں کا ایک المیہ کم علم اور دنیا دار رہنما اور دانشور ہیں جو اپنے آپ کو دنیا کا اعتبار سمجھتے ہیں۔ لوگوں کو ترک دنیا کا درس دیتے ہیں اور خود ان کے ایمان پر "برائے فروخت" کی تختی آویزاں ہے۔ یوں سادہ اور کم علم لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ دنیا میں کئی جگہوں پر ایسے مراکز قائم ہیں جہاں دہشت گردی اور انتہا پسندی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کچھ ممالک اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ان مراکز کی فنڈنگ کرتے ہیں۔ اخلاقی اقدار اس حد تک کمزور پڑ چکی ہیں کہ ان رہنماؤں کو جو لوگوں کو ترک دنیا کا درس دیتے ہیں چند ڈالروں میں خریدا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے الفاظ میں اثر باقی نہیں رہا اور لوگ نہ تو ان کی بات سننا چاہتے ہیں نہ ان پر اعتبار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سجاد نے ان نام نہاد مذہبی رہنماؤں کے اس کردار کو بھی اپنے افسانوں میں بے نقاب کیا ہے۔ اپنے افسانے "آنکھ اور سایہ" میں رقمطراز ہیں:

"یار دینے، کسی سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھو ہمیں تو ایسے خواب کبھی نہیں آتے"۔

"پوچھی تھی یار..... امام صاحب سے۔"

"پھر.....؟"

"بس کچھ نہ پوچھو وہ کہتے ہیں کہ بہت ثواب کا کام ہے۔

سیدھا جنت میں۔"

"تو مولوی یہ کام خود کیوں نہیں کر دیتا۔"

"یار! تم ہمیشہ اوکھی بات ہی کرنا۔ مولوی کو تو بخش دو۔"(۱۱)

انتہاپسندی کی یہ تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ نوجوانوں کو عام اور معصوم لوگوں کے قتل کرنے پر جنت کی بشارت سنائی جاتی ہے۔ افسانہ نگار نے علماء کے دہرے رویے کو بھی بیان کیا ہے کہ خود کش کرنے سے اگر جنت مل سکتی ہے تو وہ خود اس جنت سے محروم کیوں ہیں؟ افسانہ نگار نے دراصل افسانہ نہیں بلکہ معاشرے کی بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا نوحہ تحریر کیا ہے۔ معاشرے کی زبوں حالی اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ مذہبی رہنما اس گھناؤنے دھندے میں ملوث ہیں کوئی دنیادار ایسی حرکت کرتا تو معاشرہ تسلیم کر لیتا لیکن مذہبی رہنماؤں کے لیے یہ قابل غور مقام ہے۔

ڈاکٹر انور سجاد کے افسانوں کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ ان کی معاشرے پر گہری نظر ہے اور انہوں نے ثقافتی اقدار کی تبدیلی کے منفی و مثبت اثرات کا تذکرہ اپنی کہانیوں میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں معاشرے کی مجموعی زبوں حالی کا تذکرہ ملتا ہے۔ جب ادارے مفلوج ہو جاتے ہیں تو عدم تحفظ کا شکار عوام مایوس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح معاشرے میں جرائم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر طرف "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" یعنی طاقت کا قانون دکھائی دیتا ہے۔

اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگ عام آدمی کے لیے رول ماڈل ہوتے ہیں۔ ان کی ہوس زر عام آدمی کو بھی مادیت پرست بنا دیتی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی معاشرے کا ہر آدمی دولت سمیٹنے کے لیے کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں سر گرداں نظر آتا ہے۔ حالانکہ ایسا کسی بھی معزز معاشرے میں نہیں دیکھا گیا۔ ترقی یافتہ ممالک میں عدل و انصاف اور قانون کی حکمرانی ہوتی ہے اور تمام لوگوں کو ترقی کے برابر مواقع میسر ہوتے ہیں اور پھر افراد معاشرہ مسلسل محنت کر کے معاشرے میں اپنا مقام پیدا کرتے ہیں۔ لیکن پسماندہ معاشروں میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ افراد کو ترقی کے برابر مواقع فراہم نہیں کیے جاتے۔ مایوس اور پسماندہ لوگ جرائم میں ملوث ہو کر جلدی امیر بننے کی

کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ افراد اپنی زندگی کو بھی خطرے میں ڈالتے ہیں اور ملک وقوم کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں بھی یہ رجحان عام ہے کہ لوگ ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں۔ اور دولت جمع کرنے کے اس جنون میں انہیں سمگلنگ جرم دکھائی نہیں دیتی۔ ملک وقوم کی محبت مادیت پرستی کے سامنے شکست کھا جاتی ہے۔ انور سجاد نے اس زنگ آلود سوچ کو اپنے افسانے "سونے کی تلاش" میں اس طرح بیان کیا ہے:

> "ڈاکٹری باقی تمام پیشوں سے زیادہ محفوظ پیشہ تو ہے پر آمدنی رفتہ رفتہ ہی بڑھتی ہے اور میں راتوں رات امیر ہو جانا چاہتا ہوں۔ یہ کتنا اچھا موقع ملا ہے سونے کی تجارت۔ اس قسم کی تجارت کو کم ظرف ہی سمگلنگ کا نام دیتے ہیں۔ لیکن میرے ملک کی معیشت! لیکن میں۔"(۱۲)

یہاں افسانہ نگار نے اس کیفیت کو بیان کیا ہے کہ جب ذاتی مفاد ملکی مفاد پر ترجیح حاصل کر لیتا ہے تو معاشرہ زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ ملک کی ترقی ہی معاشرے کی ترقی کی ضامن ہے۔ ذاتی مفادات پر ملکی مفادات کو ترجیح دے کر ایک خود دار قوم تشکیل پاتی ہے۔ مسلسل محنت ایک اچھا رویہ ہے۔ انسان محنت کر کے آہستہ آہستہ ترقی کی منزل حاصل کرے تو اس میں لطف بھی ہے اور ملکی مفاد کا تحفظ بھی۔ شارٹ کٹ ملک اور افراد دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

اردو افسانے میں بانو قدسیہ کا منفرد مقام ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ ان کے افسانے "امر بیل" میں بھی ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار موجود ہے۔ مغربی تہذیب نے مشرق کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ شرم وحیاء اور رکھ رکھاؤ مشرقی تہذیب کا حسن تھا۔ بچوں کی تربیت میں مشرقی اقدار کو مد نظر رکھا جاتا تھا اور لڑکیوں کو گھروں اور تعلیمی اداروں میں شرم وحیاء، پردہ اور عجز و انکساری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان کے لباس سے ان کی شرافت جھلکتی تھی اور کوئی شخص مادر پدر آزاد نہیں تھا۔ مشترکہ خاندانی نظام تھا اور ہر شخص تمام مثبت اقدار کو مد نظر رکھتا تھا۔ برطانیہ نے کافی عرصہ متحدہ ہندوستان پر حکومت کی اس دوران انہوں نے ہندوستانی ثقافت کو ہر طرح سے متاثر کیا جس سے زبان ولباس اور کھانوں کے علاوہ لوگوں کے رویے بھی تبدیل ہو گئے۔ ثقافتی تبدیلیوں کے یہ اثرات اب تک جاری ہیں۔ سائنسی ترقی نے تبدیلی کی اس رفتار کو اور تیز کر دیا ہے۔ الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے مغربی کلچر بہت تیزی سے مشرق میں پھیل رہا ہے۔

مغربی ثقافت کا اثر ہے کہ مشرقی عورت بھی شرم وحیاء اور پردہ اور چار دیواری کی قید کو توڑ کر آزادی کی خواہش مند ہے۔ مشرقی خاتون مغرب کی ظاہری چمک دمک سے متاثر دکھائی دیتی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ

مغربی خاتون نام نہاد آزادی سے زبوں حالی کا شکار ہے کیوں کہ اس نام نہاد آزادی نے مغربی خاتون کو ذمہ داری کے بوجھ کے نیچے دبادیا ہے۔ مغربی معاشرے میں مرد نے اپنی تمام ذمہ داریاں خاتون پر ڈال دی ہیں جبکہ مشرقی معاشرے کا یہی حسن ہے کہ یہاں مرد و خواتین کی ذمہ داریاں ایک جیسی نہیں ہیں لیکن ظاہری چمک دمک سے متاثر پاکستانی خواتین بھی نوکری کرنے کی خواہش مند نظر آتی ہیں اور زیبائش و آرائش کی بھی رسیا ہیں۔ اب وہ شو پیس بن کر لوگوں کے سامنے آنا چاہتی ہیں۔ مشرقی عورت کو نیم عریاں لباس زیب تن کرنے کا بھی خبط ہے کیوں کہ وہ نمائش اور زیبائش کے ذریعے دوسرے لوگوں پر اپنی دھاک بیٹھانے کی خواہش مند ہے۔ ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو بانو قدسیہ اپنے افسانے "امر بیل" میں یوں ضبط تحریر میں لاتی ہیں:

> "شامیانے تلے اکابرین شہر کا سیلاب آیا ہوا تھا مجمع میں عورتوں کی اکثریت تھی .....اکثر اس لیے آئی تھیں کہ ان کے پاس کچھ ایسے لباس تھے جو لوگوں کو دکھانے بہت ضروری تھے کچھ اس لیے تشریف لائی تھیں کہ صبح ہی انہیں اپنی ہمسائی اور دوستوں کو بتانا تھا کہ رات وہ بھی کنسرٹ پر موجود تھیں کچھ محض اس لیے چلی آئی تھیں کہ آج شام کنسرٹ سے بہتر شہر میں اور کوئی پروگرام نہ تھا.....بیگمات کی خیرہ کن زیبائش ایسی تھی کہ بڑی بڑی رسہ گیر طوائفیں کان پکڑتیں اور ان سے لباس پہننے کا سبق حاصل کرتیں۔"(۱۳)

کنسرٹ اور خواتین کے نیم برہنہ لباس یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مشرقی ثقافت کافی حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ اب عورت شرم و حیاء کا پیکر نہیں بلکہ نمود و نمائش کا نام ہے۔ اب سے چند برس قبل عورت کا طوائفوں سے بھی زیادہ عریاں لباس پہن کر گھومنا اور کنسرٹ میں شرکت کرنا خواب و خیال ہی ہو سکتا تھا اور اب افسانہ نگار کے مطابق کنسرٹ میں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی اور لباس و زیبائش میں وہ طوائفوں کو شکست دے رہی تھیں۔

بانو قدسیہ بیان کرتی ہیں کہ دین سے لوگ فی الحقیقت دور ہو گئے ہیں، ایمان کمزور پڑ چکے ہیں اور لوگوں نے آخرت کو فراموش کر دیا ہے۔ اس ہدایت کو بھی فراموش کر دیا گیا ہے جو سرور کائنات نے جہالت کے اندھیرے ختم کرنے کے لیے لوگوں تک پہنچائی تھی۔ ایک طرف تو انسان کو مال و دولت جمع کرنے کا اشتیاق ہے اور دوسری طرف وہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ جب والدین اس حد تک اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوں تو نسل نو کا مادر پدر آزاد ہونا لازمی بات ہے۔

ساٹھ کی دہائی میں افسانے کی افق پر ظاہر ہونے والی خالدہ حسین نے اپنے افسانوں میں موجود کرب سے

لوگوں کو چونکا دیا۔ قراۃ العین حیدر کے بعد وہ واحد خاتون افسانہ نگار ہیں جنہوں نے زندگی کی شدت اور پیچیدگیوں میں روندے جانے والی نفسی کیفیات کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے معاشرے میں عورت کی بے بسی کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عورت کو صرف قربانی کا استعارہ سمجھنا اور معاشرتی تذلیل کا نشانہ بنانا ہمارے معاشرے میں قابل فخر سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے اندر اعلیٰ اقدار میں تیزی سے تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ وہ اقدار جنہیں عالمی سطح پر تسلیم کیا جاتا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اقدار معدوم ہو رہی ہیں۔ ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو خالدہ حسین نے محسوس کیا ہے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ مرزا حامد بیگ اپنی کتاب "اردو افسانے کی روایت" میں خالدہ حسین کی افسانہ نگاری کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں تحریر کرتے ہیں:

> "عالمی سچائیاں ایک کے بعد ایک سرد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ زندگی رفتہ رفتہ گزشتہ اقدار سے خالی ہوا چاہتی ہے عدم تحفظ کا احساس بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہی خالدہ حسین کے افسانوں کا بنیادی طرز احساس ہے۔"(۱۴)

انسان نے سائنسی ترقی کر لی ہے بلکہ ترقی کی بام عروج پر پہنچ چکا ہے۔ تانگہ ماضی کی سواری تھی لیکن اب تانگوں کی جگہ سڑکوں پر گاڑیاں دھواں اڑاتی نظر آتی ہیں۔ منجن سے ٹوتھ پیسٹ تک کے سفر میں ہم نے ہر چیز جدید کر لی ہے۔ اسی جدت پسندی میں انسانوں نے مہلک ہتھیار بھی تیار کر لیے ہیں جنہیں جنگوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ انسان نے ترقی کے نکتہ عروج پر پہنچ کر ایٹم بم بھی ایجاد کر لیا ہے مگر یہی ترقی اب انسان کے لیے دردِ سر بنی ہوئی ہے۔ جدید انسان نے درختوں کو کاٹ کر آبادیاں بنالی ہیں اور انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے صنعتی یونٹ قائم کیے ہیں۔ درختوں کی کمی اور مہلک دھویں کی زیادتی انسان کے ماحول کو خراب کر رہی ہے۔ ان صنعتی یونٹوں سے نکلنے والا گندہ پانی صاف نہری پانی کو آلودہ کرنے کا سبب ہے۔ جدید انسان کا ایجاد کردہ ایٹم بم پوری دنیا کے لیے خطرے کی علامت ہے کہ اس کا استعمال انسانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔

اس درجہ ترقی کے باوجود انسان تسکین حاصل کرنے کی بجائے مسائل کا شکار ہے۔ موسموں میں شدت آگئی ہے۔ گرمی شدت اور طوالت اختیار کر رہی ہے۔ سمندری طوفانوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ آندھیاں شدت اور کثرت سے آتی ہیں۔ ترقی کا دعویٰ کرنے والا انسان اس قدر پریشان ہے کہ اسے ڈیپریشن، سردرد، بلڈ پریشر، نیند آور اور وٹامنز کی گولیاں کثرت سے استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ ان ثقافتی تبدیلیوں کا اظہار خالدہ حسین کے افسانوں میں جگہ جگہ ملتا ہے اپنے افسانے "سواری" میں وہ تحریر کرتی ہیں:

"اکثر لوگوں کو گرانی اور خفگان کا آزار رہنے لگا اور ڈاکٹروں کا کاروبار خوب چمکا۔ دانشوروں کا کہنا تھا کہ ایٹمی تجربات سے دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف اثرات ہو رہے ہیں۔ یہ عجیب و غریب مہک بھی انہی تجربات کا اثر ہے اور اسی باعث لوگوں کے اعصاب کی حالت نازک ہو گئی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے دکانوں سے اعصابی تھکن دور کرنے کی دوائیں ختم ہونا شروع ہوئیں۔ یہ بھی نہ تھا کہ دوائیں کم مقدار میں آتی ہوں مگر اہل شہر میں اس دوا کی ذخیرہ اندوزی کا عجب جنون پھیلا تھا کہ چند ہی دن میں نیند کی گولیاں بھی گوہر نایاب ہو گئیں۔"(۱۵)

رشید امجد نے اپنے افسانوں میں اپنی ثقافت، اپنے ماضی، اپنی شاندار روایات اور سب سے بڑھ کر انسان کا اپنا وہ تشخص جو بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار میں گم ہو کر رہ گیا تھا اس کی پہچان کو زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں اپنی جڑوں یعنی شاندار ماضی کے توسط سے ادراک ذات میں مشغول نظر آتے ہیں۔ پاکستانی معاشرہ اور ثقافت و تہذیب اپنے قیام سے اب تک انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ فرد اپنی پہچان کے گم ہونے پر افسردہ ہے اور وہ بار بار اپنی ثقافت، تہذیب اور رسماجی کشمکش میں اپنے مثبت وجود کا کھوج لگاتا نظر آتا ہے۔ بے یقینی و مایوسی کی فضا کے طاری ہونے کا سب سے بڑا سبب احساس کا مردہ ہونا ہے، ضمیر جب مردہ ہو جاتے ہیں تو انسان باوجود کوشش کے خود کو تلاش کرنے اور اپنی پہچان سے قاصر ہو جاتا ہے۔ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار نے انسان کے ضمیر سے احساسات کو جب بے دخل کر کے محض رونق میلے اور نمود و نمائش تک ہی ثقافت اور اقدار کو محدود کر دیا تو انسان بے یقینی کا شکار ہو گیا۔ اجتماعی سطح پر ضمیر کی موت نے انسان کو اپنی شناخت سے محروم کر کے رکھ دیا۔ ماضی کی درخشاں ثقافتی روایت سے منہ موڑ کر جب ثقافتی اقدار نے خود کو بدلنا شروع کیا تو نمود و نمائش تو خوب ہوئی لیکن اقدار رخصت ہو گئیں۔ رشید امجد کے افسانوں میں ثقافتی اقدار کے اسی زوال اور اس زوال کے نتیجے میں سماجی سطح پر ہونے والے تغیرات کی عکاسی خوب ملتی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر نوازش علی لکھتے ہیں:

"رشید امجد اپنے افسانوں میں حال کی بے معنویت، اپنے تشخص کی تلاش، یقین و بے یقینی، ہے اور نہیں ہے کے درمیان ان کا رہنا، عمل اور بے عملی، ہونے نہ ہونے کی پکار، دنیا داری اور درویشی کے درمیان کشمکش، متضاد عناصر کا باہم دست و گریباں ہونے، بے چہرگی کا ملال، سیاسی و سماجی و تاریخی جبر، ظلم و خوف، حالات کی بے رخی، احساس شکست، اجنبیت، بے معنویت، عصری حسیت اور جدید زندگی کی پیچیدگیوں کے بارے میں کئی ایک زاویوں اور گوشوں سے بیک وقت سوچنے کے عمل سے گزرتا ہے۔"(۱۶)

ثقافتی اقدار کی تبدیلی نے انسان سے جو اپنی شناخت چھینی ہے، اس کا اظہار رشید امجد کے افسانے ”تماشا

عکس تماشا" میں خوب ملتا ہے۔ ایک دور وہ تھا کہ علاقے اور محلے اپنے مکینوں کے ناموں اور کارناموں سے پہچانے جاتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ماضی میں بہت سے گھرانوں کی پہچان ان کے مکینوں کی مختلف سماجی اور ثقافتی اقدار کی بنا پر ہوتی تھی مثلاً پہلوانوں کا محلہ، کتابوں والے کا گھر اور اس طرح کے دیگر بہت سی ثقافتی اقدار انسان کی پہچان تھیں۔ لیکن وقت گزرنے کا ساتھ ساتھ ان ثقافتی اقدار میں ایسی تبدیلی آئی کہ مکانوں کے ساتھ ساتھ مکینوں کی پہچان بھی معدوم ہوتی چلی گئی اور صورت حال یہاں تک پہنچ گئی کہ نام پوچھنے پر جواب ملتا ہے۔

" جناب میرا کوئی نام نہیں ...... نام تو اب ایک سوکھی ٹہنی ہے۔ میرا تو اب صرف نمبر ہے۔ ۲۴ ۸۲۷۰۔۴۰۔۲۱۱ جناب یہاں اب محلوں اور گلیوں کے بھی نمبر ہیں، نام تو اب بس گئے دنوں کی خوشبو ہیں اور خوشبو لوٹ کر کب آتی ہے۔"(۱۷)

نام سے نمبر تک کا ثقافتی سفر اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے کرتے انسانوں کی پہچان کو ہی معدوم کرتا چلا گیا اور یہ معدومی عارضی نہیں بلکہ مستقل نظر آتی ہے۔ رشید امجد نے علامتی انداز میں اپنے افسانوں میں یہ حقیقت جس طرح بیان کی ہے وہ مستقل معدومی کو ظاہر کرتی ہے مثلاً زبان بندی کی بجائے زبان کو دیمک لگنا، قلم کا زنگ آلود ہونا اور اب گئے دنوں کی خوشبو یہ وہ علامتیں جو مستقل معدومی کو ظاہر کر رہی ہیں۔ یہاں ثقافتی اقدار اس حد تک تبدیل ہوتی چلی جارہی ہیں کہ ماضی کی اقدار کی بحالی ناممکن نظر آنے لگتی ہے۔ ثقافتی اقدار کی یہ تبدیلی محض ایک فرد تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ شہر کے شہر اس کے زیر اثر آتے چلے جاتے ہیں۔

"تو تمہارا شہر؟"

"جناب میرا شہر بھی اب نمبر ہے۔ زپ نمبر۔

پھر اس کے اندر نمبر... شہروں کے اندر شہر اوران کے اندر اور شہر......

تہہ در تہہ شہر ہی شہر۔"(۱۸)

شہروں کے اندر تہہ در تہہ شہروں کا ہونا ہی دراصل ثقافتی تبدیلی کا ثبوت ہے۔ شہر محض کسی جگہ بہت سے لوگوں کے جمع ہو کر رہائش اختیار کر لینے کا نام نہیں بلکہ کسی بھی شہر کی تشکیل میں ثقافت بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اور پھر جب شہر کے اندر تہہ در تہہ شہر بسنے یا بننے کی طرف اشارہ کیا جارہا ہو تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر میں ثقافتی تغیرات تیزی سے رونما ہو رہے ہیں اور یہی ثقافتی تغیرات لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے چلے جا رہے ہیں کیوں کہ یہ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ ایک ثقافت کے حامل لوگ خود کو دوسری ثقافت کے باشندوں سے مختلف خیال کرتے ہیں۔ اور اگر ثقافت کی بنیادیں ٹھوس ہوں تو وہ ثقافت ہی ان کی پہچان بن جاتی ہے۔ یوں تہہ در

تہہ شہر بسنے سے باشند گان کی اجتماعی شناخت منقسم ہو کر مختلف ثقافتوں میں ڈھلتی نظر آنے لگتی ہے۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں ثقافتی اقدار میں تبدیلی کے اس پہلو کو خوب نمایاں کیا ہے۔

جدید اردو افسانے میں محمد منشایاد کا منفرد مقام ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات عام آدمی کی زندگی سے متعلق ہیں۔ چونکہ ان کا اپنا تعلق عام گھرانے سے تھا اس لیے وہ عام آدمی کے مسائل و مشکلات سے باخوبی واقف دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں مقامی رنگ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرے کی ثقافت میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان پر ان کی گہری نظر ہے اور ان کا اظہار وہ اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے بارے میں ممتاز مفتی اپنی رائے ان الفاظ میں دیتے ہیں:

> "منشایاد کے افسانوں سے مٹی کی بو آتی ہے اس کے کردار دھول سے اٹے ہوئے ہیں۔ مناظر میں اداس ویران کھیت پھیلے ہوئے ہیں۔ بوسیدہ راہٹ چلاؤں چلاؤں کراہتے ہیں۔ سہمے ہوئے اداس مگر مطمئن گھروندے آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں اور ان کی مٹی میں اٹے ہوئے سادہ اور سچے جذبات کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں..... میری دانست میں منشا دھرتی کا بالک ہے اور ہمیں سچے پاکستانی عوام سے متعارف کراتا ہے۔"(۱۹)

پاکستانی معاشرے میں شہری علاقوں میں تو ثقافت تیزی سے تبدیل ہوئی ہے لیکن عام دیہات بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔ اب دیہاتوں میں بھی ثقافتی تغیر نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ یہ تبدیلیاں ایک تو سائنسی ایجادات کی مرہون منت ہیں اور دوسرا سوشل میڈیا نے بھی انسان کے طور طریقوں کو کافی تبدیل کیا ہے۔ چند ہی برس پہلے دیہات کی اپنی ایک ثقافت تھی لوگوں کا آپس میں گہرا تعلق تھا ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کیا جاتا تھا لیکن اب وہاں بھی صورت حال مختلف ہے۔

سائنسی ترقی نے دیہی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا ہے چند برس قبل کی بات ہے ٹی وی پورے گاؤں میں ایک دو گھروں میں ہوتا تھا اور گاؤں کے تمام لوگ اس گھر میں آکر ڈرامہ، میچ یا فلم سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ گھر کا دروازہ کیا تھا ایک چادر کا پردہ کیا ہوتا تھا۔ اکثر گاؤں تو ایسے تھے کہ وہاں بجلی ہی نہیں تھی اور ڈیرے پر ٹریکٹر کی بیٹری سے ٹی وی چلایا جاتا تھا اور تمام لوگ ڈیرے پر اکھٹے ہو کر خبریں وغیرہ دیکھتے تھے۔ پھر ہر گھر میں فریج اور ٹی وی آگیا تو میل ملاقات کا یہ بہانہ بھی ختم ہو گیا۔ ہر گھر میں موجود بجلی کے کنکشن نے دیہات کی ثقافت کو متاثر کیا۔ جب برقی پنکھے چلے تو گھروں کے باہر پیپل کی گھنی چھاؤں میں چارپائیاں ڈال کر قدرتی ماحول میں گپیں ہانکنے کا رواج ختم ہونے لگا۔ گھروں کے نقشے تبدیل ہونے لگے اور دیہاتوں میں بھی شہر کی طرز پر گیراج اور ٹی وی لاؤنج

والے گھر تعمیر ہونا شروع ہوئے۔گھروں کو بڑے بڑے آہنی گیٹوں کے ذریعے بند کر دیا گیا جو کپڑے کے دروازے کے برعکس ہمیشہ بند رہنے لگا۔ انسان ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے یہاں تک کہ پڑوسیوں کے دکھ درد سے بھی ناآشنا ہو گئے۔اس ثقافتی تبدیلی کی عکاسی منشایاد نے اپنے افسانے "الہام" میں بھرپور انداز سے کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"زمانہ تو یہاں بھی بدل گیا ہے" میجر صاحب بولے "مگر سمجھنے کی ضرورت ہے" یہ میز کرسیاں، پلیٹیں، بجلی، پنکھا اور فریج،، عثمان خان کی پھوپھی بولیں "یہ سب کہاں تھے گاؤں میں"

"یہ روشنی کا زمانہ ہے" کرنل صاحب نے کہا نئی نئی چیزیں ایجاد ہو گئی ہیں جس سے فاصلے سمٹ گئے اور رسم و رواج بدل گئے ہیں اب شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کا ایک دوسرے کو دیکھنا اور پسند کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے"

ہاں ذہنوں میں بیداری پیدا ہو گئی ہے۔اب شادی بیاہ کے معاملے میں زبردستی ممکن نہیں۔

میجر صاحب نے لقمہ دیا"چند برسوں میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔"(۲۰)

گویا چند ہی برسوں میں دیہات کے مکینوں نے بھی اپنے طرز زندگی کو تبدیل کر لیا ہے۔اب وہاں مٹی کے برتنوں میں کھانا نہیں کھایا جاتا۔ مٹی کے ہنڈیا ماضی کی داستان بن گئی ہے۔ زمیں یا چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ وہاں بھی اب میز کرسیوں پر بیٹھ کر کھانا کھانے کا رواج ہے۔ پاکستانی معاشرے میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ اور شرم وحیا کی ایک تہذیب تھی جس کو مد نظر رکھا جاتا تھا۔ لڑکی لڑکے کا شادی سے قبل ملنا اور ایک دوسرے کو دیکھنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا اور بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ خاوند سہاگ رات اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کا پہلا دیدار کرتا تھا۔ لڑکی اور لڑکے کو دیکھنا اور پسند کرنا بزرگوں کی ذمہ داری تھی۔ لیکن شہر تو شہر اب دیہاتوں میں بھی گرل فرینڈ کا رواج ہے۔ مخلوط تعلیمی نظام ہے۔ میل فی میل کا اکھٹے گھومنا، ہوٹلنگ اور شاپنگ کرنا اب معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ یہ رشتہ ریت پر کھڑی دیوار سے بھی کمزور ہوتا ہے لیکن پھر بھی اب لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کو پسند کر کے والدین کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہمیں نکاح کے بندھن میں باندھ دیں۔ ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار میں جتنے بھی اچھے یا برے پہلو ہوں، یہ حقیقت ہے کہ وہ ثقافتی اقدار جن سے ہمارے معاشرے کا حسن تھا یکسر تبدیل ہو گئی ہیں۔

منشایاد کے افسانے انسان کی اخلاقی بدتری کی بھی عکاسی کرتے ہیں۔ رشوت کی کئی اقسام ہیں اور وہ تمام اقسام ہمارے معاشرے میں رائج ہو چکی ہیں۔ کہاں تو ماضی کے وہ بے لوث لوگ تھے جو انسانوں کی خدمت کے

لیے اپنا سب کچھ وقف کر دیتے تھے اور کہاں آج کا مفاد پرست انسان جو اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔ عام دفتر سے لے کر اعلیٰ حکام کے دفاتر تک کوئی کام رشوت اور شفارش کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مجبور کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا انسان کا وطیرہ بن گیا ہے۔ معاشرے کی حالت اس حد تک دگرگوں ہو چکی ہے کہ مجبور خواتین کو جنسی طور پر حراساں کیا جاتا ہے۔ وہ خواتین جو عام گھروں میں کام کرتی ہیں وہ دولت مندوں کے شر سے محفوظ نہیں ہیں۔ دفاتر میں کام کرنے والی خواتین کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تعلیمی ادارے بھی اس برائی کی زد میں آ چکے ہیں۔ اسلام نے عورت کو جو عزت اور مرتبہ عطا کیا تھا بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار نے اس سے وہ مقام چھین لیا ہے۔ وہ خاتون جو دوسروں کی محتاجی سے بچنے کے لیے اپنے اور بچوں کے لیے رزق حلال کمانا چاہتی ہے اسے معاشرہ مختلف طریقوں سے ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ منشایاد کی معاشرے پر گہری نظر ہے انہوں نے اپنے افسانوں میں انسان کی اس عیاری اور عورت کی مجبوری کو کئی حوالوں سے بیان کیا ہے۔ اپنے افسانے "خواب راستہ" میں لکھتے ہیں:

"پاس کرانی ہے تو ہیروئن کو ساتھ لاؤ"

بہت مشکل ہے یار، آج کل بہت نخرہ کرتی ہیں۔

"سائیڈ والی سے کام نہیں چل سکتا"

"کوالٹی پر منحصر ہے۔"(۲۱)

انسان اپنے گناہوں کی سزا عورت کو دیتا ہے۔ اسلام نے عورت کو اسی ذلت اور پستی سے نکالا تھا جس ذلت اور پستی میں معاشرے نے اسے دوبارہ ڈال دیا ہے۔ جب کسی معاشرے میں بنیادی اخلاقی اقدار کو فراموش کر کے کھلی بے حیائی کو فروغ دیا جاتا ہے۔ حکمران ظالم بن جاتے ہیں۔ طاقتور کمزور پر ظلم کرتے ہیں۔ ریاست کو معاشی طور پر تباہ کر دیا جاتا ہے۔ طاقت ور افراد جنسی تسکین کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے ہیں تو ایسا معاشرہ تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ خدا کا عذاب اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور ایسی بستیاں زمیں سے مٹا دی جاتی ہیں۔ معاشرے میں واقع ہونے والی ان ثقافتی تبدیلیوں کو منشایاد نے اپنی کہانیوں میں بڑی مہارت سے پیش کیا ہے اور ان تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تباہی و بربادی سے انسان کو آگاہ کیا ہے۔

مسعود اشعر اردو کے نمائندہ اور ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ مسعود اشعر ترقی پسند نظریے سے متاثر تھے اس وجہ سے کچھ عرصہ زیر عتاب بھی رہے۔ مسعود اشعر نے افسانہ مقدار میں کم لیکن معیاری لکھا۔ جدید اردو افسانے کا اعتبار مسعود اشعر کی وجہ سے قائم ہے۔ ادیب کی نظر معاشرے پر بہت گہری ہوتی ہے۔ ادیب وہ چیزیں بھی دیکھ رہا ہوتا ہے جو عام آدمی کو نظر نہیں آتیں۔ مسعود اشعر نے بھی معاشرے کی اقدار کو گہرائی سے دیکھا ہے آصف فرخی

نے مسعود اشعر کے افسانوں کے بارے میں اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے:

"مسعود اشعر کا افسانہ بھی اس دور میں برپا ہنگامہ خیز تبدیلیوں سے عبارت ہے لیکن وہ کسی مخصوص انداز سے تعلق استوار کرنے کی بجائے عصری تقاضوں سے قریب رہتے ہوئے تجربات اور جدت کے قائل رہے اسی لیے یوں لگتا ہے کہ ان کا افسانہ حیرت اور تشویش کے رنگوں سے مل کر بنا ہے۔"(۲۲)

زمانہ جس تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور سائنسی ایجادات نے جس طرح دنیا کو گلوبل ویلج میں تبدیل کر دیا ہے اس کی عکاسی مسعود اشعر کے افسانوں میں موجود ہے۔ سائنسی ایجادات نے زمانے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے انسان کی زندگی یکسر تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ چند دہائیاں پہلے کی بات ہے کہ دور دراز مقیم دوستوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کا اہم ذریعہ خطوط تھے۔ کیونکہ اس دور میں پڑھے لکھے لوگ کم تعداد میں تھے اس لیے محلے کا ڈاکیا بہت قابل احترام ہوتا تھا اور تمام محلے والے اسے اپنا ہمراز مانتے تھے۔ کیوں کہ وہ خطوط پڑھ کر سنا بھی دیا کرتا تھا اور جواب بھی تحریر کر دیا کرتا تھا۔ پھر سائنسی ایجاد ٹیلی گرام کے ذریعے لوگ اپنے عزیز و اقارب کی خیریت معلوم کرنے لگے۔ اس کے بعد لینڈ لائن ٹیلی فون آ گیا اور لوگ ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو گئے لیکن یہ بھی اتنا جدید ذریعہ نہ تھا کال بک کرانا پڑتی تھی اور گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ کار فون کی ایجاد نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا اور لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ انٹرنیٹ کی ایجاد نے رہی سہی کمی بھی پوری کر دی۔

لوگوں نے اس ایجادات کا استعمال اپنی ذہنی بلوغت کے مطابق کیا اور ان کے فوائد و نقصانات دونوں سے مستفید ہوئے۔ یقیناً ان ایجادات کی وجہ سے لوگوں کا طرز زندگی تبدیل ہوا۔ خطوط کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ٹیلی گرام کا محکمہ بند ہو گیا۔ پی ٹی سی ایل فون بھی بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ موبائل فون اور اس پر میسر انٹرنیٹ کا دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بالخصوص نوجوان نسل پارک، کھیل کے میدان، میل ملاپ اور دکھ سکھ میں کم ہی نظر آتی ہے۔ پوری دنیا سے دوستی اب انٹرنیٹ کے ذریعے ہے چاہیے اپنے پڑوسی کے نام سے بھی واقفیت نہ ہو۔ ان ایجادات نے نوجوان نسل کو تباہ بھی کیا ہے۔ نوجوان اپنی تعلیم سے غافل سارا دن اسی انٹرنیٹ پر بیٹھ کر وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ جہاں نسل نو کا تعلیمی معیار خراب ہو رہا ہے وہی ان کی صحت بھی خراب ہو رہی ہے۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک سب انٹرنیٹ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس ایجاد نے سچائی اور اعتماد کے رشتوں کو بالخصوص ختم کر دیا ہے۔ لڑکے لڑکیاں اپنی جنس تبدیل کر کے دوسرے لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انٹرنیٹ بڑے بڑے مالی فراڈ کا ذریعہ بھی بنی ہوئی ہے۔ ان ثقافتی تبدیلیوں کو مسعود اشعر نے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے اپنے افسانے "بیسویں صدی کی آخری کہانی" میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"آج میں آرکی ٹیکچر پر ہی مضامین اور کتابیں دیکھوں گا،
یہ کہہ کر اس نے ڈسکیٹ نکال کر ایک طرف رکھی اور انٹرنیٹ کھول لیا تھا۔
اس کے سامنے بہت سے انٹرنیٹ میڈیا نیٹ ورک تھے۔ یا ہو تھا، ایمزون تھا، چوک تھا اور امریکا آن لائن تھا لیکن اسے آسک جیوز سب سے اچھا لگتا تھا۔"(۲۳)

مسعود اشعر نے نوجوان نسل کی حقیقت کو اپنے اس افسانے کے اندر بیان کر دیا ہے۔ نوجوان نسل کسی بھی قوم کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے جو کہ اپنا اور قوم کا وقت ضائع کر رہی ہے اور اخلاقی زبوں حالی کا شکار ہے۔ دراصل انٹرنیٹ کے ذریعے مغربی کلچر فروغ پا رہا ہے جس نے تمام معاشروں کی اپنی زد میں لیا ہوا ہے۔

جو قومیں زوال کا شکار ہوتی ہیں ان کی ثقافت بھی زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ زوال پذیر معاشرے اپنی تمام اقدار کو فراموش کر کے ترقی یافتہ معاشروں کی تقلید کرتے ہیں۔ اگر زبان کی بات کی جائے تو انسان کی فطری طور پر اپنی علاقائی اور قومی زبان سے محبت ہونی چاہیے لیکن حالات اس کے برعکس ہیں نسل نو انگریزی سے متاثر دکھائی دیتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو بااختیار طبقے کی انگریزی سے محبت ہے اور دوسرا مغربی قوم کی ترقی ہے۔ ملکی نظام دیکھیں تو وہ اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ انگریزی زبان سیکھی جائے یہاں تک کہ انگریزی زبان کو ترقی کا ضامن قرار دے دیا گیا ہے۔ دراصل یہ بھی احساس کمتری کے علاوہ کچھ نہیں انگریزی محض زبان ہے سائنس نہیں ہے اور علوم تمام زبانوں میں ترجمہ کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن نوجوان نسل مغربی کلچر سے متاثر دکھائی دیتی ہے۔ زبان سے لے کر رہائش اور رویوں تک میں تبدیلی آچکی ہے۔ محلے داری مشرقی معاشرے کا حسن تھا لیکن اب پڑوسی ایک دوسرے سے آشنا نہیں ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتے۔ ان تمام حالات کی ذمہ داری آج کے دور کی جدید ایجادات ہیں جنھوں نے پرانی اقدار کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ اپنے افسانے "زرد پتوں کا بن" میں مسعود اشعر نے ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"دو تین سال کے اندر رہی ہماری گلی مکانوں سے بھر گئی بیس مکان تھے ہماری گلی میں۔ دس ادھر اور دس ادھر۔ اب سب پڑوسی تھے اور کوئی کسی کا پڑوسی نہیں تھا۔ کسی کو کیا ضرورت تھی کہ معلوم کرتا کہ کس مکان میں کون آیا ہے۔"(۲۴)

اسد محمد خان نے اپنے افسانوں کا آغاز بیک وقت غصے اور عجز سے کیا۔ جس کا ثبوت ان کے افسانے "باسودے کی مریم" اور "ہے للالا" ہیں۔ معاشرے میں پائے جانے والے دو کرداروں سے انہیں نفرت ہے ایک ملائیت اور دوسرا بیوروکریسی۔ ان کا خیال ہے انہی دو کرداروں نے معاشرے کو زبوں حالی تک پہنچایا ہے۔ اسد

محمد خان دھرتی سے جڑے ہوئے ادیب ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے معاشرے میں تبدیل ہوتی ہوئی ثقافتی اقدار کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جدید اردو افسانے میں اسد محمد خان نے اپنی صلاحیت کی بدولت اعلیٰ مقام پیدا کیا ہے۔

موجودہ دور میں جو ثقافتی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس میں سے ایک اہم تبدیلی یہ ہے کہ معاشرے کے باصلاحیت لوگوں کو نظر انداز کیا جارہا ہے۔ خوشامدی اور ابن الوقت قسم کے لوگ ترقی حاصل کر رہے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس فن، مہارت، تعلیم اور تجربہ ہے لیکن اہل اقتدار کا قرب حاصل کرنے اور خوشامد کے فن سے عاری ہیں، ناکام ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ایک ریاست جہاں ترقی اور کامیابی کا معیار چاپلوسی ہو وہاں کس قدر ترقی اور خوشحالی ممکن ہے۔ یقیناً ایسی ریاست کا مستقبل خطرناک ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور ریاست کی بقاء کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اسد محمد خان نے اپنے افسانے "ہے لَلا لَلا" میں اس صورت حال کو بیان کیا ہے۔ استاد عاشق علی خان کو جو باصلاحیت فن کار ہے موت آجاتی ہے یا مار دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ ایم ایف رحیم لے لیتا ہے۔ دراصل ان کا اشارہ اس طرف ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں باصلاحیت حکمران جو دستور کے مطابق ریاست کو چلانا چاہتا ہے بیوروکریٹس اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں اور ایک نیا کٹھ پتلی حکمران تیار کر لیتے ہیں جو بظاہر حکمران ہوتا ہے لیکن حکم بیوروکریٹس کا چلتا ہے۔ افسانہ نگار نے ہمیں بتایا ہے کہ اس حکمران کی حیثیت اس طرح ہوتی ہے جس طرح کلاسیکی موسیقی کے سامنے جدید فوک موسیقی کی کہ جس میں صوت کی سروں کی بجائے تار کی سروں پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور فن کی بجائے نیم عریاں حرکات وسکنات سے لوگوں کو محظوظ کیا جاتا ہے۔ ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو اسد محمد خان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "ان سب کو سورج میں جگہ بنانی ہے۔ یہ سورج کا برص آباد کرنے والے لوگ ہیں، یہ لافانی ہیں۔ ہر بار جب جوڈریل بینک کی رصد گاہ سورج میں کسی نئے اسپاٹ کی خبر دیتی ہے میں سمجھ جاتا ہوں کہ استاد عاشق علی خان مر گیا اور ایم ایف رحیم اور سسہ کاری دینے والے جھینگر لونڈے نے اپنے لیے سورج میں جگہ بنالی اور آنکھ مارنے والی تسوفی اور آر سہول ڈکاسٹا اور ہوموسیکچوئل پروڈیوسر اور چالیس ہزار نیم مردہ بیوروکریٹس کو ایک اور مہلت مل گئی۔"(۲۵)

اسد محمد خان نے علامتی انداز میں اپنا ماضی الضمیر خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ عروج، اقتدار اور عہدے جن لوگوں کے لیے مخصوص ہیں وہی سورج میں جگہ بنانے والے ہیں۔ ہر دور میں وہ اقتدار میں کسی صورت موجود رہتے ہیں۔ بس استاد عاشق علی خان کی اس نظام میں جگہ نہیں ہے اور اس کی وجہ عاشق علی خان کی اصول

پسندی ہے۔

مظہر الزمان وہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے اندھیرے میں تیر نہیں چلایا بلکہ انہوں نے علامت کا استعمال بہت سوچ بچار سے کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے لفظوں میں معنی کی کئی تہیں موجود ہیں۔ مظہر الزمان حقیقت نگار ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی کہانیوں کا تعلق زمین سے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں مقامی ثقافت کی جھلک نظر آتی ہے۔ جب جب اور جہاں جہاں ان ثقافتی اقدار میں تبدیلی آئی ہے وہ اس کی عکاسی بھی اپنے افسانوں میں کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں سے متعلق محمد غالب نشتر نے اپنی رائے ان الفاظ میں دی ہے:

> "وہ زمین اور اس سے جڑے مسائل پر کہانیاں لکھتے ہیں انہوں نے زمین میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات کو اتنی چابک دستی سے فن پارے میں سمو دیا ہے کہ قاری سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے اور اس طرح ان کا افسانہ آفاقی ہو جاتا ہے۔"(۲۶)

سماجی ابتری بتاتی ہے کہ حالات کو یہاں تک پہنچانے میں ہر فرد نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ جب نظام عدل پر بھی سوالیہ نشان ہوں تو معاشرے میں باقی کیا امید رہ جاتی ہے۔ بظاہر تو عدالتی نظام درست نظر آتا ہے اور عدالت، منصف اور کٹہرے کے الفاظ پرکشش دکھائی دیتے ہیں لیکن جب عام شہری کا ان ناموں سے عملی واسطہ پڑتا ہے تو اس کے دل میں سوائے نفرت کے اور کوئی جذبات باقی نہیں رہتے۔ انصاف کی فراہمی جو کہ عدالتوں کی بنیادی ذمہ داری ہے، کہیں نظر نہیں آتی۔ درحقیقت عدالتیں انصاف گاہ نہیں بلکہ جرائم کی پناہ گاہ بن چکی ہیں۔ مفت اور بروقت انصاف کی عدم فراہمی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ اس کا اظہار مظہر الزمان کے افسانے ''دستاویز'' میں ملتا ہے۔ اپنے افسانے میں انہوں نے بتایا ہے کہ عدالت میں ایک بے رحم مجرم موجود ہے جسے ہمارا عدالتی نظام بچانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ ہتھیار پر بھی اس مجرم کی انگلیوں کے نشان موجود ہیں لیکن وکیل اس کا بھرپور دفاع کر رہا ہے۔ وکیل کی بحث کے بعد مجرم عدالت میں اپنا دفاع ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "یور آنر! آج ہم سبھوں کے ہاتھ ایک جیسے ہو چکے ہیں اور اگر میری بات پر یقین نہ آئے تو سب سے پہلے وکیل سرکاری کی انگلیوں کے فنگر پرنٹ نکال کر دیکھی جائیں اور میرا دعویٰ ہے اس قتل میں وکیل سرکاری بھی شامل ہیں۔"(۲۷)

مجرم کی آخری خواہش کو پورا کرنے کے لیے وکیل سرکاری کے فنگر پرنٹ نکالے جاتے ہیں وہ نشان ہو بہو قاتل کے نشان جیسے ہوتے ہیں یہاں تک کہ عدالت میں موجود تمام لوگوں اور جج کی انگلیوں کے نشانات بھی قاتل کی انگلیوں کے نشانات سے میل کھاتے ہیں۔ بالآخر جج ہتھیاروں کو مجرم قرار دے کر پھانسی کا حکم سنا دیتا ہے۔

افسانہ نگار نے اپنی کہانی میں سماجی ابتری کو بیان کیا ہے۔ غریب کے لیے انصاف کی تلاش سعی لاحاصل ہے۔

بنے ہیں اہل حوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں؟ کس سے منصفی چاہیں؟

جدید اردو افسانے میں مظہر الاسلام کا منفرد مقام ہے۔ جب انہوں نے افسانہ لکھنا شروع کیا تو افسانے کی دنیا میں حقیقت نگاری کی روایت سے بغاوت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ مظہر الاسلام کا خاصا یہ ہے کہ انہوں نے بزرگوں کی تقلید کی اور نہ ہی نوجوان نسل کا راگ الاپا بلکہ انہوں نے اپنی الگ راہ خود تخلیق کی۔ انہوں نے پاکستانی ثقافت اور فوک لور کے موضوع پر لگ بھگ پچاس کتابیں ایڈٹ کی ہیں یہی وجہ ہے کہ پاکستانی ثقافت پر انکی گہری نظر ہے اس لیے پاکستانی ثقافت میں جہاں جہاں بدلاؤ آیا ہے اس کا بھرپور عکس مظہر الاسلام کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ایک اور بات جو انہیں ثقافت کے میدان میں معتبر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہیں لوک ورثے کا قومی ادارہ اسلام آباد میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا جس سے ان کو ثقافتی پہلوؤں سے اور واقفیت حاصل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنی اردگرد کی زندگی کو احسن طریقے سے بیان کیا ہے۔ قومی زندگی کا عکس ان کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے فتح محمد ملک تحریر کرتے ہیں:

> "موضوع کے انتخاب کو دیکھیں تو مظہر الاسلام کے افسانے ہماری قومی سرگزشت نظر آتے ہیں۔ وہ سیاسی شعور اجتماعی احساس اور قومی وابستگی کو نئے پن سے متصادم نہیں سمجھتے۔ ان کی کہانیوں میں ہماری عذاب ناک صورت حال کی معنی خیز اور اثر انگیز مصوری ملتی ہے۔ وہ ہمیں ہمارے معاشرے کے بیمار اور جاں بلب ہونے کا تشویش ناک احساس دلاتے ہیں۔"(۲۸)

معاشرے کی مجموعی کیفیت سے اس کے اداروں کی کارکردگی کا باخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مظہر الاسلام نے اداروں کے زوال کی داستان کو بھی اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ اداروں کی کارکردگی دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ گویا یہ ادارے انتقال کر چکے ہیں۔ اپنے افسانے "اناللہ وانا الیہ راجعون" میں بتاتے ہیں کہ آمریت کے دور میں ایک شخص کی آواز گم ہو چکی ہے یعنی اسے اظہار خیال کی آزادی حاصل نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ سے اپنی آواز تلاش کرتا ہے۔ ناکام رہنے پر تھانے جاتا ہے جہاں اسے عام شہری سمجھ کر خوب زدوکوب کر کے حوالات میں بند کر دیا جاتا ہے۔ رہائی کے لیے وہ ایک وکیل کی خدمات حاصل کرتا ہے اور آواز کی بازیابی کے لیے قانونی مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وکیل کے جواب سے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ نظام عدل جو پہلے ہی زوال پذیر تھا آ

مریت کے دور میں آخری سسکیاں لے رہا ہے۔ یہ نظام عدل دراصل امیر اور طاقت ور کے گھر کی باندی ہے۔ تنزل کی اس کیفیت کو کو مظہر الاسلام نے اپنے افسانے "اناللہ وانا الیہ راجعون" میں اس طرح بیان کیا ہے:

"پھر میں ایک چٹ پر لکھ کر کہتا ہوں میں عدالت سے رجوع کرنا چاہتا ہوں۔ وکیل اپنے کالے کوٹ کی جیبوں میں جھانک کر مجھے مشورہ دیتا ہے کہ قانونِ ضرورت کے آگے تمام انسانی ضرورتیں ہیچ ہیں اور اس کیس میں کوئی جان نہیں۔"(۲۹)

کہاں تو وہ اسلامی ریاست مدینہ کہ حضور اکرم ﷺ امیر غریب مسلم و غیر مسلم سب کو فوری اور مفت انصاف فراہم کرتے تھے کہاں آج کا عدالتی نظام جو انصاف کے حصول کے لیے غریب کو کپڑے بیچنے پر مجبور کر دے لیکن انصاف پھر بھی نہ ملے۔ صرف یہ نہیں کہ ہمارے عدالتی نظام کو دیمک لگ گئی ہے بلکہ پورا معاشرہ ہی بے حسی کا شکار ہیں۔ مدینہ کی ریاست میں جھوٹی گواہی کا تصور بھی نہیں تھا لیکن اب ہماری اقدار اس حد تک تبدیل ہو چکی ہیں کہ جھوٹ بولنا یا جھوٹی گواہی دینا ہمارے معاشرتی نظام کا جز بن گیا ہے۔ عدالتی نظام اتنا فرسودہ ہو چکا ہے کہ اب کوئی بھی مجرم وعدہ معاف گواہ بن کر اپنی سزا ختم کرا سکتا ہے اور المیہ یہ ہے کہ یہ وعدہ معاف گواہ اکثر جھوٹی گواہی دیتے ہیں۔ یوں مجرم رہا ہو جاتا ہے اور ملزم سزا کاٹتا ہے۔

مظہر الاسلام نے اپنے افسانے "پنجرہ" میں اس نظام پر خوب طنز کی ہے۔ ایک فرد حق بات کہتا ہے اور معاشرے میں موجود برائیوں کی نشان دہی کرتا ہے تو اسے پاگل قرار دے کر قتل کر دیا جاتا ہے۔ عدالتی کاروائی میں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ مقتول پاگل تھا اور ذہنی توازن درست نہ ہونے کی وجہ سے اس نے خود کشی کر لی ہے۔ وکیل سمیت تمام افراد اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک شخص جو مقتول کا قریبی دوست تھا، سزا کے خوف سے وعدہ معاف گواہ بن جاتا ہے۔ وہ شخص جو معاشرے کو روبہ زوال کرنے والی برائیوں پر فکر مند ہے اور اصلاح معاشرہ کے لیے لوگوں کو اچھائی کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے اسے پاگل قرار دے کر قتل کر دیا گیا ہے اور عدالت سے انصاف کی فراہمی بھی ممکن نہیں ہوئی۔ ایک لڑکی جو اس بے حس معاشرے میں تنہا انصاف کی جنگ لڑ رہی ہے وہ عدالت میں کوئی گواہ پیش نہیں کر سکتی کیونکہ کوئی حق کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہی نہیں۔ افسانہ نگار نے انسان کی مفاد پرستی اور بے حسی کو ان الفاظ بیان کیا ہے:

"پھر اس لڑکی سے کہا گیا۔

کیا وہ اس کے حق میں کوئی گواہی پیش کر سکتی ہے؟

لڑکی نے اپنی مٹھیاں مضبوطی سے بھینچ لیں۔ جناب والا اس شہر کا دستور ہے کہ جب کوئی عدالت کے

کٹہرے تک آجاتا ہے تو پھر شہر کا کوئی شخص اس کے حق میں گواہی نہیں دیتا کمرہ عدالت میں موجود لوگ اونچی آواز میں گفتگو کرنے لگے.....

ہاں اس کا گواہ وہی ہے..... خدا گواہ ہے وہ پاگل نہیں تھا۔"(۳۰)

مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں ماضی اور حال دونوں دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں تنوع اور ندرت کا عنصر موجود ہے۔ انسان کی سوچوں اور حالات میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس کی خوب ترجمانی انہوں نے اپنے افسانوں میں کی ہے۔ حامد بیگ کی منفرد خوبی ہے کہ انہوں نے افراد کی دہری شخصیات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ خاص کر وہ لوگ جو لوگوں کی جان ومال کے محافظ ہیں، قانون کے رکھوالے ہیں، مذہبی رہنمائی کے دعوے دار ہیں اور وہ جنہوں نے انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے نام نہاد ادارے تشکیل دے رکھے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے معاشرے کے ان کرداروں کو بے نقاب کیا ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جو کبھی مذہب، کبھی سیاست اور کبھی انسانی فلاح کے لبادے اوڑھ کر معصوم لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ دراصل اس لبادے کے اندر انہوں نے منافقت کو چھپایا ہوتا ہے۔ حامد بیگ نے اپنے کرداروں کے ذریعے ان بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں فیصل جعفری تحریر کرتے ہیں:

"مرزا حامد بیگ اپنے کرداروں کے تئیں جس گرم جوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ زندگی سے ان کی گہری قربت کا مظہر ہے۔ مرزا صاحب زندگی کی بے معنویت سے زیادہ اس کی تہ در تہ معنویت کو اجاگر کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے کردار انسان کی نفسیاتی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں اور بدلتی سماجی اقدار کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ کرداروں کی ذاتی زندگی میں جو گھپلے نظر آتے ہیں، حامد بیگ انہیں بھی بیان کرنے میں تکلف سے کام نہیں لیتے۔"(۳۱)

مرزا حامد بیگ اپنے افسانوں میں بتاتے ہیں کہ ثقافتی اقدار یہاں تک تبدیل ہوچکی ہیں کہ مذہب، اخلاقیات اور سیاست کو ذاتی مفادات حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔ سیاست اور مذہب کے نام پر روپیہ جمع کیا جاتا ہے۔ وہ پیسہ کہاں جاتا ہے اور اس کا استعمال کیا ہے یہ بات سب کو معلوم ہے۔ مذہب اور عوامی فلاح و بہبود کے ٹھیکیداروں کا اپنا کردار کتنا منافقانہ ہوتا ہے اگر بغور جائزہ لیا جائے تو شرمندگی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ عوامی فلاح و بہبود کے ان ٹھیکیداروں کی اخلاقی حالت اتنی ابتر ہے کہ طوائفوں کو بھی انہوں نے اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا ہے۔

بازار حسن کس مقصد کے لیے قائم کیے جاتے ہیں، ان کی سرپرستی کس کے سپرد ہے اور ان بازاروں

سے استفادہ کون کرتا ہے ؟ یہ بات قابل غور نہیں ہے کہ ان طوائفوں کو اس حالت تک پہچانے والا کون ہے ؟ تحقیق یہی بتاتی ہے کہ بااختیار اور مال دار لوگوں نے ان طوائفوں کو اس حالت تک پہنچایا ہے۔ اکثر پیشہ ور خواتین معاشرے کے ہاتھوں مجبوراس دھندے میں ملوث ہیں اور وہ ایک خاوند کے ساتھ باعزت زندگی گزارنے کی خواہش مند ہیں لیکن تقدیر نے ان کو جس مقام پر پہنچادیا ہے وہاں سے واپسی ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ انسانی فلاح کی تنظیموں نے کبھی یہ غور نہیں کیا کہ ان خواتین کے مسائل کیا ہیں ؟ کتنی بوڑھی طوائفیں بیمار ہیں اور انہیں علاج کی ضرورت ہے لیکن کوئی ان کی مدد کے لیے نہیں پہنچتا۔ بلکہ سماجی منافقت کی انتہا ہے کہ یہ بوڑھی خواتین اپنے کوٹھے کا ماہانہ بھتہ سرکاری اہل کاروں اور سماجی خدمت گزاروں تک پہنچاتی ہیں۔ گویا عوامی فلاح و بہبود کے یہ ٹھیکے دار انہی خواتین کی کمائی سے اپنی آسائشوں کا سامان کرتے ہیں۔ سرکاری مشینری اور مذہب وملت کی پاسبانی کا دعویٰ کرنے والے لوگوں کو انہی کوٹھوں پر جنسی راحت بھی فراہم کی جاتی ہے۔

مرزا حامد بیگ نے اپنے افسانے "جانکی بائی کی عرضی" میں قوم کے ان نمائندوں کی منافقت کو بے نقاب کیا ہے۔ رلیارام جو اب لاہور میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری ہیں۔ جب ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے تو جانکی بائی کی صحبت میں وقت گزارتے رہے۔ جب انہیں ملازمت مل گئی تو جانکی بائی سے لاتعلقی اختیار کرلی۔ افسانہ نگار نے یہاں جانکی بائی کو اعلیٰ اخلاقی اقدار پر فائز کرتے ہوئے رلیارام سے زیادہ بااصول، وفادار اور ہمدرد خاتون ثابت کیا ہے۔ وہ اسے نہ صرف بغیر پیسوں کے قبول کرتی ہے بلکہ اس کی ضروریات بھی پوری کرتی ہے لیکن رلیارام سرکاری نوکر ہونے کے بعد عوامی فلاح کی تنظیموں کے ساتھ مل کر انہی طوائفوں کو شہر بدر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن سے وہ جنسی تسکین حاصل کرتے رہے ہیں۔ کیوں کہ اب ان کا خیال ہے کہ شہر لاہور کو اس گندگی سے پاک کرنا چاہیے۔ جب طوائفوں کو ان کے گھر چھوڑنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ وکیل کے ذریعے ایک درخواست لکھتی ہیں۔ اس درخواست میں انہوں نے نام نہاد اصلاح پسندوں کی اخلاقی حیثیت کو ان الفاظ میں بے نقاب کیا ہے:

> "ڈپٹی کمشنر نے ذاتی معائنے کے بعد یہ فیصلہ دیا تھا کہ چکلہ اور شراب خانہ جہاں ہیں وہی رہنے چاہیں..... یہ لوگ بڑے معمولی قسم کے ہیں اور تحریک خلافت کے کارکن ہیں۔ انہوں نے درخواست گزاروں سے خلافت کمیٹی کے لیے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکامی کے بعد انہوں نے میونسپل کمیٹی کو ہمارے خلاف درخواستیں دینی شروع کردی ہیں اور ان لوگوں کی غلط رہنمائی میں کمیٹی نے ہمیں محلہ خالی کرنے کے نوٹس جاری کر دیے ہیں لیکن کوئی متبادل جگہ تجویز نہیں کی ہے ..... ہم جو بہت غریب ہیں اور آئے دن کے جرمانوں نے ہمیں افلاس کی آخری حدوں تک پہنچادیا ہے آپ سے رحم کی

درخواست کرتی ہیں۔"(۳۲)

یہ وہ معاشرتی منافقت یا دہرا انسانی معیار ہے جسے مرزا حامد بیگ نے بے نقاب کیا ہے۔ مذہب کے ان ٹھیکیداروں کی حقیقت لوگوں کے سامنے رکھی ہے۔ دراصل معاشرہ اس حد تک زوال کی لپیٹ میں آچکا ہے کہ مذہب کی آڑ میں یہ لوگ ان مظلوم پیشہ ور خواتین سے پیسہ بٹور کر پر آسائش زندگی کا سامان کرتے ہیں۔

اپنے دیگر ہم عصر افسانہ نگاروں کی طرح نیلم احمد بشیر نے بھی اپنے افسانوں میں بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کا اظہار کیا ہے۔ ان کی کہانیاں بتاتی ہیں کہ معاشرہ ایک جگہ منجمد نہیں ہو سکتا وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مثبت اور منفی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ انسان ترقی پسند ہے، اس نے اپنی سہولت کے لیے کافی کچھ ایجاد کر لیا ہے اور سہولیات کے کھوج کا یہ سفر مسلسل جاری ہے۔ ہمارے معاشرے میں زیادہ تر تبدیلیاں مغرب سے آئی ہیں اور لوگوں نے ان تبدیلیوں کی اندھا دھند تقلید کی ہے۔ بہت سی تبدیلیاں ایسی ہیں جو ہمارے معاشرے کے لیے مناسب نہیں ہیں۔

پاکستان میں مشترکہ خاندانی نظام قائم ہے۔ باپ دادا تک ایک ہی گھر میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ بزرگوں کا نہ صرف خیال رکھا جاتا ہے بلکہ ان کی عزت و احترام کو عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ مشرقی معاشرے کی یہ روایت ہے کہ اگر کسی بزرگ کو گھر سے نکالا جاتا ہے تو اولاد کی ناک کٹ جاتی ہے۔ لیکن اب پاکستانی معاشرہ بھی مغرب سے متاثر دکھائی دیتا ہے اور ان کی ثقافت یہاں تیزی سے فروغ پا رہی ہے۔ اب یہاں بھی بزرگوں کی خدمت اور احترام کا جذبہ سرد پڑتا جا رہا ہے۔ اسے تیز رفتار زندگی کہیں یا ثقافت کی تبدیلی کہ پاکستان میں بھی اب اولڈ ہوم قائم ہو رہے ہیں۔ اکثر مرد اور ان کی شریک حیات ملازمت پیشہ ہیں، بچے سکول چلے جاتے ہیں اور بزرگوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی فرد گھر پر موجود نہیں ہوتا۔ اس لیے پاکستان کے شہری علاقوں میں اب یہ رواج فروغ پا رہا ہے کہ بزرگوں کو اولڈ ہوم منتقل کر دیا جاتا ہے تاکہ وہاں ان کی مناسب دیکھ بھال ہو سکے اور وہ تنہائی کا شکار نہ ہوں۔ ستاروں پر کمند ڈالتے، ترقی یافتہ انسان کے لیے یہ مقامِ عبرت ہے کہ انسان کے ارد گرد لاکھوں انسان ہیں لیکن وہ پھر بھی تنہا ہے۔ ہر خاص موقع پر اپنے جگر گوشوں سے دور انسانوں میں گھرے معمر افراد کی اپنوں کی راہ تکتی پر نم آنکھیں ہماری ترقی پر سوالیہ نشان ہیں اور ہمیں یہ پیغام دے رہی ہیں کہ جو ہم بو رہے ہیں، کل وہی فصل ہمیں کاٹنا ہو گی۔ اس معاشرتی المیے کو نیلم احمد بشیر نے اپنے افسانے "چارہ گر" میں اس طرح بیان کیا ہے:

"عافیت گھر کیا ہے؟ اسلم نے دلچسپی سے پوچھا۔ بھئی مغربی طرز پر یہاں ایک بوڑھوں کے رہنے کا ادارہ قائم کیا گیا ہے بلکہ میں تو ان کی بورڈ آف ڈائریکٹر میں سے ہوں بزرگ خواتین حضرات کی ہر طرح سے

دیکھ بھال اور دلجوئی کی جاتی ہے۔ میڈیکل سٹاف آن ڈیوٹی ہوتا ہے۔ واقعی بھابھی! یہ تو بہت امپریس کرنے والی بات ہے! ویسے ایمان کی بات کہوں گا پاکستان نے ترقی بہت کرلی ہے ڈش انٹینا، موبائل فون، انٹرنیشنل لیول کے سکول، ریستوران اور اب یہ عافیت گھر!۔"(۳۳)

پاکستانی معاشرے نے "اپنے گھر" سے "عافیت گھر" تک کا سفر مکمل کرلیا ہے۔ آہستہ آہستہ پاکستانی معاشرے میں مغرب کی طرح گھر ویران اور ہوٹل آباد ہو رہے ہیں۔ جدید ثقافت نے انسانوں کو گھروں سے ہوٹلوں میں منتقل کر دیا ہے اب عافیت گھر قائم کیے جارہے ہیں جو لوگوں سے ان کی دعائیں رحمتیں اور عافیت کو چھین رہے ہیں۔ جدید ایجادات نے معاشرے پر کافی منفی اثرات بھی مرتب کیے ہیں۔ موبائل فون نے سہولت سے زیادہ مسائل سے نوازا ہے اور جدید تعلیمی ادارے طلباء کے کردار کو ختم کر رہے ہیں۔ ترقی کے اس سفر میں ماضی کی کئی خوبصورت ثقافتی اقدار ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ہیں۔

ثقافتی اقدار جب تبدیل ہوتی ہیں تو ان میں منفی اور مثبت دونوں رجحانات پروان چڑھتے ہیں۔ ادیب ماہر نباض کی طرح ان تمام تبدیلیوں پر اپنی نظر رکھتا ہے اور ان کا اظہار اپنی تخلیقات میں کرتا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں دیگر معاشرتی عناصر کی طرح بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو بھی بیان کیا ہے۔ جہاں انہوں نے مثبت تبدیلیوں کو سراہا ہے وہی منفی تبدیلیوں کا نوحہ بھی تحریر کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں ساٹھ کی دہائی میں مخصوص حالات کی بناپر تیزی سے ثقافتی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ان کا اظہار تمام ادبی تخلیقات میں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جدید افسانہ نگاروں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ بدلتی ہوئی ثقافتی اقدار کو بیان کرنے میں باقی تمام تخلیق کاروں پر برتری حاصل کرتے دکھائی دیتے ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۹۷

۲۔ ممتاز مفتی، "ماں نمانہ"، مشمولہ سمے کا بندھن، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۳ء، ص ۶۳

۳۔ ممتاز مفتی، "کمرا نمبر ۱۷"، مشمولہ سمے کا بندھن، ص ۱۴۹

۴۔ احمد ندیم قاسمی، "بیٹے بیٹیاں"، مشمولہ افسانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۲۰۱

۵۔ احمد ندیم قاسمی، "چوری"، مشمولہ افسانے، ص ۵۸۳

۶۔ اشفاق احمد، "پل صراط اور پاسپورٹ"، مشمولہ صبحانے افسانے، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۲۱۳

۷۔ قراۃ العین حیدر، "فوٹو گرافر"، مشمولہ اردو افسانے کی روایت، ص ۹۵۸

۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص ۶۱۹

۹۔ انتظار حسین، "محل والے"، مشمولہ گنی چنی کہانیاں، دہلی: وکاس پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۲ء، ص ۴۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۱۔ انور سجاد، ڈاکٹر، "آنکھ اور سایہ"، مشمولہ چوراہا، لاہور: مکتبہ نئی مطبوعات، ۱۹۶۷ء، ص ۵۸

۱۲۔ انور سجاد، ڈاکٹر، "سونے کی تلاش"، مشمولہ چوراہا، ص ۷۴

۱۳۔ بانو قدسیہ، "امر بیل"، مشمولہ امر بیل، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۲۴۰

۱۴۔ مرزا حامد بیگ، اردو افسانے کی روایت، ص ۱۱۷

۱۵۔ خالدہ حسین، "سواری"، مشمولہ انتخاب خالدہ حسین، ترتیب وانتخاب آصف فرخی، کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس ۲۰۱۷ء، ص ۸

۱۶۔ نوازش علی، ڈاکٹر، "رشید امجد کے افسانوں کی اسلوبیاتی اساس"، مشمولہ رشید امجد ایک مطالعہ، ترتیب و تعارف ڈاکٹر شفیق انجم، راولپنڈی: نقش گر، ۲۰۰۹ء، ص ۳۷

۱۷۔ رشید امجد، "تماشا عکس تماشا"، مشمولہ پت جھڑ میں خود کلامی، راولپنڈی: اثبات پبلی کیشنز، ۱۹۸۴ء، ص ۶۸

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ممتاز مفتی، "پیغام"، مشمولہ بند مٹھی میں جگنو از محمد منشایاد، لاہور: مکتبہ شاہکار، ۱۹۷۹ء، ص ۱۷۷

۲۰۔ محمد منشایاد، "الہام"، مشمولہ پانی میں گھرا پانی، انتخاب وترتیب محمد حمید شاہد، لاہور: مکتبہ شاہکار، ۱۹۸۰ء، ص ۱۶۰

۲۱۔ محمد منشایاد، "خواب راستہ"، مشمولہ پانی میں گھرا پانی، ص ۲۶۵

۲۲۔ آصف فرخی،"فلیپ"، مشمولہ انتخاب مسعود اشعر از آصف فرخی، کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۷ء

۲۳۔ مسعود اشعر، "بیسویں صدی کی آخری کہانی"، مشمولہ انتخاب مسعود اشعر، ص ۱۵۷

۲۴۔ مسعود اشعر، "زرد پتوں کا بن"، مشمولہ انتخاب مسعود اشعر، ص ۱۶۸

۲۵۔ محمد اسد خان، "ہے لَلالَلا"، مشمولہ کھڑکی بھر آسمان، کراچی: ابن حسن پریس، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۹

۲۶۔ محمد غالب نشتر، اردو افسانہ نئی جہت، دہلی: جے کے آفسیٹ، ۲۰۱۶ء، ص ۱۷۸

۲۷۔ محمد مظہر الزمان خان، "دستاویز"، مشمولہ شوریدہ زمین پر دم بخود شجر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء، ص ۷۰

۲۸۔ فتح محمد ملک، "مظہر الاسلام کی افسانہ نگاری"، مشمولہ گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی از مظہر الاسلام، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص ۲۶۷

۲۹۔ مظہر الاسلام، "اناللہ وانا الیہ راجعون"، مشمولہ گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۲۷

۳۰۔ مظہر الاسلام، "پنجرہ"، مشمولہ بارش کی باتوں میں بھیگتی لڑکی، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء، ص ۵۱

۳۱۔ فضیل جعفری، "ابتدائیہ"، مشمولہ جانکی بائی کی عرضی از مرزا حامد بیگ، اسلام آباد: دوست پبلیکیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۸

۳۲۔ مرزا حامد بیگ، "جانکی بائی کی عرضی"، مشمولہ جانکی بائی کی عرضی، ص ۴۱

۳۳۔ نیلم احمد بشیر، "چارہ گر"، مشمولہ جگنوؤں کے قافلے، لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۵